پیش دستیاں

ڈاکٹر وحید قریشی

مقبول اکیڈمی، اُردو بازار، لاہور

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
-1	(۱) ریڈیائی مزاح	7
-2	(۲) قصہ چہار ادیب	17
-3	(۳) میر جملہ لاہوری کے کالم	29
-4	(۴) تحریفات	68
-5	(۵) اشتہارات	79
-6	(۶) میر جملہ لاہور کا ادبی خبرنامہ	84
-7	(۷) مزاحیہ تبصرے	110

(۱)

ریڈیائی مزاح

ایک اقبالی نقّاد

میں ایک اقبالی نقّاد ہوں۔ کچھ سال ادھر اقبال کا نام لوگوں کی زبانوں پر آیا ہے اور ہم لوگوں نے اسے اپنایا ہے۔ اپنا بھی یہی خیال ہے کہ دنیا میں کچھ کام کر جائیں۔ ہمارا حق تو اقبال پر اور بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ بچپن میں ان کا فوٹو دیکھا تھا۔ اور میں نے اسی زمانے میں اندازہ کر لیا تھا کہ یہ شاعر اگر زندہ رہا تو دنیا کا بڑا شاعر ہوگا۔ میرا کہنا سچ ثابت ہوا۔ اور آج اقبال دنیا کے بڑے شاعر ہیں۔ افسوس صد افسوس۔

ع آن قدح پشکست و آن مسافر ماند

آج اقبال اس دنیا میں نہیں ہم آپ افسوس کرنے کو رہ گئے ہیں۔ لیکن آج کا دن افسوس کا نہیں۔ اس موضوع پر اس سے پہلے میرے ۳۶۷۰ مقالے چھپ چکے ہیں، جن میں کم و بیش ایک ہی مضمون تھا، جسے ذہن نشین کرانے کے لئے میں نے بار بار ادا کیا تھا۔ جاہل اسے تکرار کہتے ہیں لیکن وہ کیا جانیں ایک مضمون کو طرح طرح سے باندھنا کسے کہتے ہیں۔

آپ کہتے ہیں میں نوحہ گری کرتا ہوں اور ان کے کلام پر تبصرہ نہیں کرتا۔ آخر میں نوحہ گری کیوں نہ کروں۔ اقبال کی موت سے جو نقصان ہوا ہے، اس کا ازالہ ممکن نہیں۔ بعض اعتراض

کرتے ہیں کہ میں ان کے کلام پر تنقید نہیں کرتا۔ میں ان کے اشعار کو پریڈ کراتا ہوں۔ اشعار کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے پریڈ بڑی ضروری شے ہے۔

کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ اقبال کے اشعار کی نثر بناتا جاتا ہوں۔ آخر مجھے کیا حق ہے کہ جو بات اقبال نے کہی ہے اپنی طرف سے بڑھاتا چلا جاؤں۔ میں تو وہی بات کہوں گا جو اقبال نے کہہ رکھی ہو۔ یہ بھی کوئی تنقید ہے کہ تنقید کرنے نکلے اقبال پر اور بیچ میں اپنی لیاقت بگھارنے لگے۔ حلوائی کی دکان اور دادا جی کا فاتحہ۔

آج کا دن فاتحہ خوانی کا نہیں۔ آج اقبال کے فلسفہ پر دو باتیں سن لیجئے۔ اقبال کا فلسفہ بڑا گہرا فلسفہ ہے کیونکہ اس میں فلسفہ بھی ہے اور گہرائی بھی۔ جب فلسفہ گہرائی کی مدد کرتا ہے اور گہرائی فلسفہ کو کھینچتی ہے تو شاعری پیدا ہوتی ہے اور علامہ اقبال اسی قسم کے شاعر تھے۔

یہ باتیں ممکن ہے آپ کی سمجھ میں نہ آئیں لیکن میں اسے اس فلسفے کی برکت سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے ایسی بلندیوں پر اڑا کر لے جاتا ہے کہ عام انسانوں کی پہنچ وہاں تک نہیں۔ اگر آپ میری باتیں سمجھنا چاہتے ہیں (اگرچہ آپ کا سمجھنا کچھ ایسا ضروری نہیں) پھر بھی میں جو کچھ کہوں سنتے جایئے اور ساتھ ساتھ پڑھتے جایئے۔ کیونکہ اتنا عام فلسفہ یک لخت آپ کے ذہن میں نہیں سما سکتا اور اگر سب باتوں کو ایک ساتھ آپ یاد رکھنے کی کوشش کریں گے تو الجھ جائیں گے۔

اقبال کے فلسفے کی پہلی شق ہے قوم کا درد، جو لوگ زمانے کے طمانچے کھائے ہوئے اور غمِ آدم سے دل کو مثل موم کر کے گرداختہ کئے ہوئے ہوں، وہ جانتے ہیں کہ قوم کا درد کیا چیز ہے اور اسے وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہیں قوم کے لئے ہر درد سے واسطہ رہا ہو۔ ہم آپ تو خدا کے گناہگار بندے ہیں اور پس اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں صراط مستقیم پر لگائے اور ہمیں نیکی کی توفیق عطا کرے۔

اقبال میں قوم کا درد موجود تھا۔ بعض کے نزدیک یہ مرض دراصل درد گردہ تھا لیکن اتنے

+ بڑے شاعر کو اتنا چھوٹا سا مرض کیسے ہوسکتا ہے۔ (تھا) ممکن ہے دردِ جگر ہی ہو کیونکہ علامہ خود فرماتے ہیں۔ع

ولیکن بندگی استغفراللہ
یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

فلسفہ خودی بڑی شے ہے اور یہی ان کا فلسفہ ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی یہی ہے کہ خدا بندے سے خود پوچھے کہ بتا اب تجھے دوزخ میں پھینکوں یا جنت میں اور وہ کہے دونوں میں۔

خودی میں ذوالفقار علی کی موٹر سے لے کر مکڑی کے جالے تک سب کچھ آ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کی نظر میں ساری کائنات آ جاتی ہے۔ آگے خودی کا سر نہان ہے جو لا الہ اللہ ہے جو تیغ نہان ہے وہ بھی لا الہ اللہ ہے۔ صنم کدہ بھی لا الہ الا اللہ ہے۔ ذیب سود و زماں بھی لا الہ الا اللہ ہے۔ غرض سدار ہے نام اللہ کا۔ یہی خودی کی معراج ہے۔ حضرات! سمجھ جایئے ورنہ قیامت کے دن آپ کو جوابدہ ہونا پڑے گا۔

لوگ کہتے ہیں اقبال کا فلسفہ نطشے کا فلسفہ ہے۔ بعض کا خیال ہے برگساں کا فلسفہ ہے، کچھ کہتے ہیں رومی کا فلسفہ ہے۔ کچھ شوپنہار کا بتاتے ہیں۔ پتہ نہیں ان میں۔ ''کون ہے؟ بہرحال سب ہمارے بزرگ یہیں ہیں اور ہم ان کی عزت کرتے ہیں۔ جو جھوٹ کہتا ہے خدا قیامت کے دن اس سے نبٹ لے گا۔ ہم آپ بیچ میں آنے والے کون ہیں؟ اتنا کہہ سکتا ہوں ان پر رومی کا اثر ضرور تھا جس کے زیر اثر انہوں نے ایک زمانہ میں رومی ٹوپی پہننا شروع کر دی تھی۔ اور اسی خیال کے پیش اثر وہ رومتہ الکبری بھی گئے تھے جہاں انہیں دلّی یاد آ گئی تھی۔ اقبال کے فلسفے نے ہمیں بتایا کہ چھوٹے بچوں کے ہاتھ میں چاقو نہ دو کیونکہ وہ اس سے اپنی انگلی کاٹ لیتے تھے۔ (کتنے

اچھی تھے وہ لوگ جو اپنے بچوں کے ہاتھ میں چاقو نہیں دیتے تھے) صرف اقبال ہی ایک ایسا شاعر ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ کبوتر کا کام اڑنا ہے بلبل کا چہکنا ہے۔ باز شکار کرتا ہے۔ شاہین پیار کرتا ہے اور مسولینی ایک ایسا شخص تھا جو اٹلی میں پیاز بویا کرتا تھا۔

سنتا ہوں کہ یورپ کے کسی لکھنے والے نے اقبال کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی شاعری دماغ کو متاثر کرتی ہے۔ ہاں صاحب کیوں نہ کرے ہم شعر پڑھتے ہیں تو سر خوامخواہ ہل جاتے ہیں اور جب سر ہلیں تو دماغ ہلے گا ہی۔ اس لئے دماغ کا متاثر ہونا برحق۔

یہ مضمون چونکہ علامہ اقبال کے نام سے شروع ہوا تھا اس لئے اسے انہیں کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس شعر کا نفس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جب جھاڑیاں چمن کی وہ سب کامل کے گانا

◆❖⌘

ٹریجڈی اور کامیڈی

ٹریجڈی کا لفظ اگر ٹریجیڈ یا سے نہیں ہے تو پھر آخر یہ کہاں سے آیا ہے۔ محققین کے نزدیک یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے اور ازل سے اس پر اختلاف ہوتا آیا ہے۔ اور ازل پر نہ آپ کا اختیار ہے نہ میرا۔ دنیا کا انحصار چونکہ اختلاف پر ہے اگر آپس میں اختلاف نہ ہو تو اچھے برے کی تمیز اٹھ جائے اور دنیا کا نظام ایک دن میں درہم برھم ہو جائے۔ اس لئے ہماری اور آپ کی عافیت اسی میں ہے کہ اختلاف کو برقرار رکھا جائے کیونکہ دنیا کا خاتمہ نہ آپ کو منظور ہے نہ مجھے۔

ٹریجیڈی اور کامیڈی کا یہ چکّر اتنا آسان نہیں کہ فوراً ہی سمجھ آ جائے، ورنہ آپ کو یہاں آنے کی ضرورت پیش آتی ہے نہ مجھے گلا پھاڑنے کی۔ ہوسکتا ہے کہ آپ میں بہت سے لوگ میری شکل وصورت سے متاثر ہو کر چلے آئے ہوں۔ اور بعض کو میں نے چائے کا وعدہ دے کر بلا لیا ہو، تاہم علمی خدمت چاہے کسی تحریص ہی سے ہو ادب کی خدمت ہے۔ لیکن ہماری ٹریجیڈی یہ ہے کہ ہم اپنی کہنا جانتے ہیں دوسروں کی نہیں سنتے۔ اور عذر یہ لاتے ہیں کہ اگر ہم بھی کہتے رہیں اور آپ بھی بولتے جائیں تو سننے والا کون ہو؟ سننے کا مسئلہ اتنا کڈھب نہیں ہے بزاخفش پر ہی موقوف نہیں، سننے والے ہر جگہ مل جائیں گے۔ جب سنانے والے مصر ہوں تو سننے والوں کو سنے بغیر چارہ

نہیں۔اکثر مشاعروں میں دیکھا گیا ہے کہ لوگ سننے سے انکار کرتے ہیں۔لیکن شاعر ہے کہ سٹیج سے اترنے کا نام نہیں لیتا۔اور پورا کلام سنا کر ہی دم لیتا ہے۔ایسے موقعوں پر یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس کی ٹریجیڈی ہوئی اور کس کی کامیڈی، کیونکہ یہاں گول کردار اور چپٹے کردار کچھ گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔چپٹی ناک والے سامعین گول مٹول کرداروں پر آوازے کسنے سے باز نہیں آتے۔حالانکہ گول ہونا فطرت کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔زمین گول ہے، اگر چپٹی ہوتی تو ہم سب لڑھک گئے ہوتے اور بعض تو اب بھی لڑھکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔گول آدمیوں کو لڑھکنا زیب بھی دیتا ہے۔لیکن جب چپٹے لوگ لڑھکتے ہیں تو گول آدمیوں کو ہنسی آتی ہے۔یہ اپنی تسکین کا سستا طریقہ سہی، لیکن دنیا سستے مال پر مرتی ہے چاہے اس میں کھونٹ کا احتمال زیادہ ہو۔

ٹریجیڈی اور کامیڈی ایسے ہی نظریئے ہیں کہیں گول مٹول آدمیوں کی کامیڈی ہے، تو کہیں چپٹے آدمیوں کی ٹریجیڈی۔چونکہ چپٹے آدمیوں کا گول ہو جانا ممکن نہیں لیکن گول آدمیوں کا چپٹا ہو جانا بہت آسان ہے۔اس سے نقادوں نے وہ طریقہ نکالا ہے کہ ٹریجیڈی میں کامیڈی ہو سکتی ہے لیکن کامیڈی میں ٹریجیڈی نہیں ہوتی۔کہنے والوں نے پتے کی بات کہی تھی اگرچہ خود انہیں احساس نہ تھا کہ وہ پتے کی بات کہہ رہے ہیں۔ورنہ شاید وہ کبھی نہ کہتے۔علم میں دوسرے کا فائدہ ہے اور دعوے میں خود اپنا۔اس لئے دوسروں کو دھوکہ دو۔علم کے حاصل کرنے سے روپے کی بربادی ہوتی ہے اور روپے کی بربادی انسان کی بربادی ہے۔پس انسان بننا برباد ہوتا ہے تو کیا حیوان زندہ نہیں رہتے؟

حیوان بننے کے بڑے فائدے ہیں۔آپ ایک وقت میں کچھ چھٹانک اناج کی بجائے دو سیر چارہ کھا سکتے ہیں۔آپ بچوں کو ڈرا سکتے ہیں۔آپ دم ہلا سکتے ہیں۔

انسانوں میں کوئی ہے ہے جو دم ہلا سکے؟ اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی جانوروں کو عطا کی ہے جانور اس کی بڑی برگزیدہ مخلوق ہے۔کیا آپ برگزیدہ ہونا پسند نہ کریں گے؟

کہاوت ہے کہ بڑا بیٹا اور کھوٹا سکّہ کبھی نہ کبھی کام آ جاتے ہیں۔کھوٹے سکّے کی کامیابی

اس میں ہے کہ چلنے کی کوشش کرے۔لیکن چلتے نہیں اور اس کوشش میں مقصد حاصل ہو جائے اور نہ ہینگ لگے اور نہ پھٹکڑی تو بات کس کے بھلے کی ہے۔

ہینگ کا استعمال تو مجھے معلوم نہیں۔اگر معالج ٹریجیڈی تک پہنچ جائے تو پھٹکڑی آپ کے کام آ سکتی ہے۔کھوٹے سکّوں پر سنتے ہیں حکومتیں نہیں چلا کرتیں۔اور جس ملک میں کھوٹے سکوں کی تعداد زیادہ ہو جائے، وہاں نظامِ حکومت بگڑ جاتا ہے۔لیکن تنقید کی قلمرو کچھ ایسی سخت جاں واقع ہوئی ہے کہ یہاں حکمرانی بھی کھوٹے سکّے کی ہے۔آپ بغیر کھیل دیکھے ٹریجیڈی اور کامیڈی کی اصطلاحوں میں تنقید کر سکتے ہیں۔آپ ڈرامہ دیکھ رہے ہیں۔کامیڈی کی نمائش ہے کھیل آخر تک غیر دلچسپ اور بے مزہ چلتا ہے۔اب آپ کی ٹریجیڈی تو بن گئی، روپے کی بربادی' وقت کی بربادی' طبیعت کا تقدّر' یہ سب المناک صورت حال نہیں، تو اور کیا ہے یہی کھیل ٹریجڈی ہے۔لیکن نقّاد ادھار کھائے بیٹھا ہے کہ اسے کامیڈی ثابت کر کے رہے گا۔نقّاد کا یہ ادھار جو وہ کھائے بیٹھا ہے، ہوسکتا ہے تھیٹر کے مالک سے ملا ہو۔یا یہ ادھار خود ڈرامہ نویس سے لیا گیا ہو آپ ان کی بات وہ نہ مانیئے لیکن اگر دوسرے دن اس کا بھی کوئی کھیل اسٹیج ہونے والا ہو تو آپ بھی ادھار کھا لیجئے کیونکہ لین دین تو ہر مذہب میں جائز ہے۔اور خدا تجارت میں برکت دیتا ہے۔کھانے کے دانت اور ہوتے ہیں دکھانے کے اور۔ڈرامہ نگاروں کے دانت نہ کھانے کے ہیں نہ دکھانے کے۔ میلے دانت کون کھائے گا اور پھر دانت دکھانا بھی مذہبی لوگوں کا پیشہ نہیں۔جگہ جگہ اور پھر ٹکٹ مقرر کر کے دانت دکھاتے پھرنا اور اسے کامیڈی کہنا شریفوں کا کام نہیں۔ میلے دانت تو پھر دیکھ لینا آسان ہے۔البتہ سفید اور چمکتے ہوئے دانت دکھانے کے لئے ایک باہم قسم کی ہٹ دھرمی کی ضرورت ہے۔سفید شے کو نظر بد جلدی لگ جاتی ہے۔جس کا خون پتلا ہو، اسے اپنے دانتوں کی حفاظت ضرور کرنی چاہئے۔دانتوں کی حفاظت بہت سی بیماریوں سے بچاتی ہے۔اس مقصد کے لئے عام بازاری منجن بہت مفید رہتے ہیں۔کیونکہ وہ غیر ضروری دانتوں کو باہر نکال دیتے ہیں۔کھانے پینے کے لئے تو دو چار دانت ہی کافی ہیں۔وہ بھی اگر ہل رہے ہوں تو بڑا مزا ہے۔دانتوں کا ہلنا بڑا

مبارک ہے۔حرکت زندگی کی طاقت ہے۔محرک دانت زندہ دانت ہوتے ہیں۔آپ زندوں سے ملیے ۔فی الحال آپ کے دانت مردہ بدست زندہ ہیں۔اس اعتبار سے محظوظ دانت کامیڈی کے اندر ٹریجیڈی ہیں۔جو صریحاً تنقیدی اصولوں کی خلاف ورزی ہے کیونکہ اگر ٹریجیڈی کی کامیڈی کے اندر ہوتے تو کل کے اندر جزو ہو جاتے جو منطقی طور پر ممکن نہیں۔آپ کہیں گے ہمارے دانت منطقی ہیں یہ درست ہے لیکن منطقی دانت بڑے فائدے کی چیز ہے۔اگر آپ غلط بات کو منطق سے دور کرنا چاہیں تو کھانے کے دانت بھی کام آ سکتے ہیں۔انسان کے اشرف المخلوقات خود کا سبب یہی ہے کہ کھانے کے دانتوں کے ساتھ ساتھ دکھانے کے دانت اسے میسر نہیں۔اگر آپ خدا کے غصے سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے تو خدا کو ایک ایسی مخلوق بنانی پڑے گی، جو اس کی نعمتوں سے بہرہ یاب ہو۔ایسے لوگوں کی اکا دکا مثالیں تو آپ کو اب بھی مل جائیں گی جو ادھر بڑے امن پسند شہری ہوں،لیکن جب موقع ملے، اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دکھانے کے دانت نکال کر فٹ (Fit) کر لیں۔آپ بحث کر رہے ہیں اس ویران میں آپ کو پتہ بھی نہیں چلا وہ حریف نے دکھانے کے دانت بھی فٹ کر لیتے ہیں۔اب آپ لاکھ چلائیے۔لاکھ چیخیئے کہ حضرت ٹریجیڈی اور کامیڈی میں فرق یہ ہے کہ ٹریجیڈی ایسے ڈرامہ کو کہتے ہیں۔جس کا انجام غم آمیز ہو۔اور کامیڈی ایسے کھیل کو کہتے ہیں،جس کا انجام ہنسی ہو۔لیکن وہ نہیں مانیں گے۔مان کے لئے الٹی منطق بڑی کارآمد شے ہے۔اس کا تعلق دانتوں سے ہے۔دل و دماغ سے نہیں ہے۔دماغ ٹھیک نہیں سوچتا ہے۔جس وقت منطق زبان سے گزر کر دانتوں کے حلقہ سے باہر نکلنے لگتی ہے تو دکھانے کے دانت اسے الٹا کھڑا کر دیتے ہیں۔سننے والے کے بالکل پتہ ذہن چلتا کہ نٹوں کا تماشا ہو رہا ہے۔اور صرف انجام پر جا کر پتہ چلتا ہے کہ کس کی کامیڈی ہوئی اور کس کی ٹریجیڈی۔یہی ڈرامائیت کا کمال ہے۔(کہ بات کا پتہ آخر میں جا کر چلتا ہے) دیکھنے والوں کو اگر درمیان میں پتہ چل جائے کہ وہ کامیڈی یا ٹریجیڈی کی طرف لیئے جا رہے ہیں۔تو وہ شاید پہلے ہی ہال خالی کر جائیں۔لیکن ایسے ہونے پر پیسے کا نقصان ضرور ہے۔وقت کا بالکل

نہیں۔ کیونکہ وقت تو بہرحال خرچ ہونا ہی ہے۔ (قت گزرتے دیر نہیں لگتی) یہی وقت کی ٹریجیڈی ہے اور جب وقت گزر جاتا ہے تو یوں سمجھئے کہ ٹریجیڈی بھی گزر گئی۔ چونکہ ٹریجیدی کے بعد کامیڈی ہوتی ہے اس لئے یہ گزرے ہوئے وقت کے مقابلہ میں کامیڈی بھی ہے لیکن یہ فیصلہ قطعی نہیں۔ ٹریجیڈی اور کامیڈی کا ہونا حالات سے زیادہ خودمختاری کی سوجھ بوجھ پر منحصر ہے۔ اور سوجھ بوجھ کا کیا اعتبار کسی چیز کو کسی وقت کیا سمجھئے۔ آپ نے اب تک میرا اور اپنا وقت ضائع کیا۔ یہ ہم دونوں کی ٹریجیڈی ہے اب مناسب یہ ہے کہ ہم اپنی اپنی لیاقت کو چھپانے کے لئے ایک دوسرے کا شکریہ ادا کریں۔ اور اپنے اپنے گھر کی راہ لیں۔

◆❖⌘

(۲)

قصہ چہار ادیب

قصہ ایک ادیب کا

پچھلے دنوں اخبارات میں ایک اشتہار نظر سے گزرا۔ یہ ایک ادبی ادارے کی طرف سے تھا۔ادارے کا نام تھا ''اکادمی ادبیات'' اس نام کے بارے میں ہم سے کئی دوستوں نے پوچھا۔کئی نے طرح طرح کے سوال کئے اور ہمیں جواب بھی سوچنے پڑے۔ہم ٹھہرے سرکاری بنچوں پر بیٹھنے والے ادیب اس لئے ہم صرف ''وقفہ سوالات'' کے دوران میں سوچنے کے عادی ہیں۔اچانک نام کی یہ توجیہہ سمجھ میں آئی کہ چونکہ یہ اکادمی ایک ہی آدمی پر مشتمل ہے جس کا نام مسیح الدین صدیقی ہے،اس بناء پر ''ایک آدمی'' (اکادمی) کہلاتی ہے۔دوسرا سوال ہم سے اس کے کام کے بارے میں کیا گیا۔اب کام ہم کیا بتائیں' ہمارے ہاں تو ادارے پہلے وجود میں آتے ہیں کام بعد میں سوچتے ہیں۔ہم اپنی حد تک یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی کام ضرور ہو رہا ہوگا کیونکہ ہم نے مسیح الدین صدیقی کو اکثر بے حد مصروف پایا ہے اور بیچارے کبھی دوڑے دوڑے کراچی جا رہے ہیں کبھی لاہور کے پھیرے ہو رہے ہیں۔ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ کر ہی رہے ہوں گے جو اتنے مصروف دکھائی دیتے ہیں اور اب تو ان کا دائرہ عمل اور بھی وسیع ہو گیا ہے۔چھوٹے چھوٹے قصبوں میں جا کر ادبی صدارتیں بھی کر لیتے ہیں اور ڈھیروں خوشامدیں وصول کر کے اسلام آباد لے

جاتے ہیں۔اس کے علاوہ ہر سال اسلام آباد میں ادیبوں کا میلہ لگاتے اور داد وصول کرتے ہیں اور سال بھر کا ''حسن کارکردگی'' کا ذخیرہ جمع کر کے اپنی عاقبت اور دوسروں کی دنیا سنوارتے ہیں۔سچ یہ ہے کہ آدمی وہی ہے جو دوسروں کے کام آئے۔ہمیں تو ادیبوں میں ایک یہی آدمی نظر آیا جو کراچی والوں کی آنکھوں کا ''تارا'' ہے اور لاہور والے بھی اسے دیدہ و دل میں بٹھاتے ہیں۔آخر دل میں نہ بٹھائیں تو کیا کریں کہ کل کلاں انہیں بھی اسلام آباد کا بلاوا درکار ہوگا۔جب سے وہ دیہات کے دوروں پر روانہ ہوئے ہیں لاہور میں ان کی نوازشوں کا دائرہ محدود ہوتا جارہا ہے۔اب تو لاہور میں صرف اپنی برادری کے لوگوں سے ملتے ہیں۔انہیں میں گھومتے پھرتے ہیں اور انہیں کو پورا پنجاب سمجھتے ہیں۔ہاں قصبات کی بات دوسری ہے۔مزاج کے اعتبار سے خود بھی قصباتی ہیں اس لئے کسب ہنر کے لئے انہیں علاقوں کا رخ کرتے ہیں، جہاں انہیں صدارت کی پیشکش ہو۔یہاں برادری اور غیر برادری کی تمیز نہیں۔ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔یہ ہنر انہوں نے کہاں سے سیکھا ہے اس کے بارے میں بھی ہم سے پوچھا گیا۔ہم ان کے خاندان سے ضرور ہیں لیکن سلسلہ کچھ بہت اوپر جا کر ملتا ہوگا۔اس لئے ان کے گھریلو حالات بھی بہت اوپر جا کر ہی معلوم ہو سکتے ہیں۔اس تگ و دو میں ہم نے کراچی تک کا ہوائی سفر کیا کہ وہاں اس مدد داتا کے پھیرے بھی زیادہ ہیں اور مانگ بھی زیادہ ہے اور اس کی بود و باش وہیں ہے اور ملازمت کا دھندا بھی وہیں شروع کیا تھا۔جو مختلف محکموں سے ہوتا ہوا اکادمی ادبیات تک آ گیا ہے۔یہ تو اس مردِ دانا کا سلسلۂ طریقت تھا۔لاہور میں اس کے سلسلۂ نسب کی تلاش بھی ہے' کراچی کے ایک محقق سے رجوع کیا جو ہر ادیب کا فائل رکھنے کے عادی ہیں اور حسب نسب کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ان سے پوچھا کہ مسیح الدین صدیقی کا حدود اربعہ بتائیں۔وہ محقق بڑے ہی غلط نکلے۔وہ تو انہیں سرے سے ادیب ہی نہیں مانتے۔ہم نے تو صدیقی صاحب کو چہرے مہرے سے ہمیشہ مؤدّب ہی پایا ہے اور ادیبوں کا مجمع ان کے اردگرد اکثر لگا دیکھا ہے جو ادب میں ان کی بڑی پہچان ہے۔پھر خدا جانے یہ محقق انہیں ادیب کیوں نہیں مانتے۔صہبا لکھنوی تو اس سال ان پر الگ نمبر نکالنے کے

بارے میں سوچ رہے ہیں اور مشفق خواجہ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ مسیح الدین صدیقی ادیب ہی نہیں۔ بھلے آدمی اگر تم وزیر آغا کو ادیب مانتے ہو وحید قریشی کو محقق مانتے ہو تو مسیح الدین صدیقی میں کیا عیب ہے۔ اسے تو بیک وقت محقق اور انشائیہ نگار دونوں ہونا چاہئے کہ اس میں دونوں ادیبوں کے خواص بیک وقت جمع ہیں۔ کدّ و سے مشابہت ان کے ادیب ہونے کے بارے میں دلیل قاطع ہے اور پھر یہ بھی مسلّم ہے کہ اکادمی ادبیات کا ڈائریکٹر جنرل بلاوجہ تو نہیں بنا ہوگا۔ کسی نہ کسی حساب سے ادیب ضرور ہوگا یا کم از کم اس کے خاندان میں ایک دو ادیب ضرور پیدا ہوئے ہوں گے۔ جن کے صدقے اسے ''ڈائریکٹر جنرل'' بنایا گیا۔

یہ تو نہیں کہ مسیح الدین علم و ادب سے بالکل کھرے ہوں۔ آخر انگریزی کے استاد رہ چکے ہیں۔ ادب کو جانتے پہچانتے ہیں اور اب تو ادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس لئے ادیبوں سے نمٹانے کا گر بھی جانتے ہیں اور کامیاب ہیں۔

◆❖⌘

قصہ دوسرے ادیب کا

اسلام آباد میں ان دنوں اختر امان کی الوداعی تقریبات کا زور شور ہے۔اختر امان، امان کی نسبت سے ہیں؟اس کا پتہ نہیں چل سکا' کیا وہ امان اس لئے کہلاتے ہیں کہ لوگ ان سے امان مانگتے ہیں یا اس لئے کہ صحافت کو''امانی'' طور پر اختیار کئے ہوئے ہیں۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''امان'' کا لفظ دراصل اماں (والدہ) ہو کیونکہ ادیبوں میں اختر امان کو جو مرکزیت حاصل ہے اس لحاظ سے انہیں ادب کی اماں کہنے میں بھی کوئی قباحت نہیں۔بہرحال اللہ تعالیٰ سب کو اپنے امان میں رکھے۔بات تقریبات کی ہورہی تھی۔ایک الوداعی تقریب میں یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ رائٹرز گلڈ کو اسلام آباد میں منتقل کیا جائے۔اس معاملے کا تعلّق الوداعی تقریب سے کیا ہے؟ ہم اس پر غور کرتے رہے۔آخر یہ بات سمجھ میں آئی کہ اختر امان کے احباب کو یہ اندیشہ ہوگا کہ اختر امان کہیں لاہور جا کر گلڈ کے چودھری نہ بن جائیں اس لئے گلڈ کو ان سے بچانے کے لئے اسلام آباد لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔دوستوں کی خیرخواہی مسلّم لیکن گلڈ کو اسلام آباد لے جا کر ادبا کیا کرنا چاہتے ہیں۔اس کا سبب سمجھ میں نہیں آتا۔

حلقۂ اربابِ ذوق کے ساتھ گزشتہ چند مہینوں سے جو سلوک ہورہا ہے۔اس کی روشنی

میں تو یہ نظر آتا ہے کہ گلڈ کی بنا مطلوب نہیں بلکہ اس کا آملیٹ بنانا مقصود ہے۔

تو کار نہیں را نکو ساختی کہ با آسماں تیز پرداختی

اختر امان بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی ''ہشت پہلو'' ادیب ہیں۔شاعروں میں شاعر' افسانہ نگاروں میں افسانہ نگار' مؤرخوں میں مؤرّخ' کالم نویسوں میں کالم نویس' مزاح نگاروں میں مزاح نگار اور پھڈہ بازوں میں نہایت اعلیٰ درجے کے پھڈے باز بلکہ پھڈے بازی میں ان کا درجہ اٹھارہ گریڈ کا نہیں بیس گریڈ کا ہے۔اس لئے انہیں پھڈے بازوں کی بیوروکریسی کا رکن قرار دیا جاسکتا ہے۔

ادب میں بیوروکریٹ ادیب سب سے اعلیٰ کوالٹی کا ادیب ہوتا ہے کیونکہ اس میں ادب کے علاوہ کئی دوسری خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ جہاں بھی جائے بہ اختیار عہدہ صدر ہوتا ہے۔دوسری خوبی یہ ہے کہ محفل میں صرف وہی بولتا ہے۔دوسرے صرف سامعین ہوتے ہیں۔تیسری خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ غیر ممالک میں ادیبوں کی نمائندگی کرتا ہے اور ادب کے تقاضوں کے بارے میں اپنے ملک کی ترجمانی کرتا ہے۔چوتھی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ ''مجسمۂ انا'' ہوتا ہے۔پانچویں خوبی یہ ہے کہ اس کا ادب زبانی ہوتا ہے تحریری نہیں ہوتا اور اگر تحریروں کی ضرورت پڑے تو یہ کام اس کا ماتحت عملہ کرتا ہے اور وہ صرف مقالے کے نیچے دستخط کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔چھٹی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر موضوع پر گفتگو کرسکتا ہے۔ساتویں خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کی رائے حتمی اور آخری ہوتی ہے۔آٹھویں خوبی یہ ہوتی ہے کہ ''ادبی دھڑوں'' کو تشکیل دینے میں ماہر ہوتا ہے اور مختلف دھڑوں کو کامیاب سیاست دان کی طرح آپس میں لڑانے کی مہارت بھی رکھتا ہے۔

اختر امان ان خوبیوں کی وجہ سے اہل لاہور کے لئے جانی پہچانی محبوب شخصیت ہے۔اب اس کی آمد پر لاہور میں دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوگا اور اہل اسلام آباد کی دعوتوں کو مات کرے گا۔احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، عطاء الحق قاسمی' امجد اسلام امجد' انور سدید، گلزار وفا

چودھری، فخر زمان، خالد احمد اور مستنصر حسین تارڑ سب ان میں بیک وقت شرکت کریں گے اور ثواب دارین حاصل کریں گے۔ اختر امان اسلام آباد کی تربیت بھی پا چکے ہیں۔ اس لئے لاہور کے جملہ حلقہ ہائے ارباب ذوق فکر مند ہیں کہ خدا جانے کس کا الیکشن افسر ہو اور کس کا کلیجہ کھا جائے کیونکہ اختر امان کی تازہ شہرت یہی ہے کہ ہندہ کی طرح کلیجے کھاتا ہے اور بعد میں راہ راست پر بھی آ جاتا ہے کیونکہ وہ خود بھی ''چپ'' سے ''راست'' پر آ چکا ہے۔

◆❖⌘

قصہ تیسرے ادیب کا

منصور قیصر کا کام اور دھندا آپس میں کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ بائیں بازو کا یہ ادیب جس کی بائیں ٹانگ بھی مفلوج ہے، مزاج کے اعتبار سے باغی اور مسلک کے اعتبار سے ترقی پسند ہے اس اقلیم میں ولیم قیصر ظفر مندی کے پھریرے اڑ رہا ہے۔ اکثر ترقی پسند کسی نہ کسی واسطے سے شہزادے ضرور ہوتے ہیں۔ اپنے فیض احمد فیض کو لیجئے یہ خان بہادر محمد سلطان کے فرزند ارجمند ہیں۔ سجاد ظہیر بھی سر وزیر حسن کے صاحبزادے تھے۔ ظہیر کاشمیری خاندان کے لحاظ سے ذرا نرم رہے لیکن انہوں نے اپنے لہجے کے طنطنے سے تلافی کر دی۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں مغل محلّات کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ وہ موسائی ستونوں اور غلام گردشوں کا شاعر ہے۔ منصور قیصر مغلیہ شہزادوں کی اس برادری کا لاڈلا ادیب ہے۔ لاڈلے بچے ذرا سے بگڑے ہوئے بچے ہوتے ہیں۔ منصور قیصر کی نثر نگاری میں بھی یہی بگڑا ہوا بچہ ہوا ہے۔ یہ بچہ شریر بھی ہے۔ سر راہ چلتے بزرگوں کے سر پر پیچھے سے آ کر دھول جماتا ہے اور بھاگ کر گلی میں چھپ جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہی بچہ اچانک بالغ ہو جاتا ہے ایسے میں وہ الھڑ شہزادہ ہے جس کے مصاحب اور درباری اس کی ہر بات پر واہ واہ سبحان اللہ کہتے ہیں۔ خود وہ اترا اترا کر باتیں کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ اس کا تیسرا

روپ ایک ولن کا ہے۔ وہ بھڑکیں مارتا ہے اس وقت اس کے ہاتھ میں قلم کی جگہ پستول ہوتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ یہ پستول نقلی ہے اور صرف دوسروں کو ڈرانے کے کام آتا ہے۔ وہ جگا ٹیکس وصول کرتا ہے اور پستول جیب میں ڈال لیتا ہے۔ اس کا چوتھا روپ ایک کامیاب سیاست دان کا ہے کیونکہ وہ ہیر وارث شاہ کا کیدو ہے جو اپنے لنگرے پن کا بدلہ دوسروں سے لیتا ہے کبھی چوچک کو کبھی کھیڑوں کو خبردار کرتا ہے۔ چھاپے مارتا ہے اور اپنی کامیابی پر تالیاں بجا بجا کر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے اندر کا بچہ اپنی پہچان کے لئے بیتاب ہے۔

اردو میں دو ادیب بہت اضطراب کا شکار ہیں۔ منصور قیصر اور مرزا ادیب' دونوں میں ایک سے زیادہ مشابہتیں ہیں۔ دونوں ڈھیروں کالم لکھتے ہیں اور پھر اپنے لکھے ہوئے پر آنسو بہاتے رہتے ہیں کہ زمانے نے ان کی قدر نہیں کی۔ دونوں کو اپنے آپ پر اختیار نہیں، اس لئے وہ دوستوں کو راضی رکھتے ہیں نہ دشمنوں کو۔ مشابہت کا یہ عالم ہے کہ دونوں تلفّظ و زبان کی ایک جیسی غلطی کرتے ہیں۔ دونوں کراچی جاتے رہتے ہیں لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ مرزا اپنی عینک کبھی نہیں بھولتے اور منصور قیصر اکثر اپنی عینک گھر پر بھول جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں منصور قیصر کراچی گئے انہیں ایک محفل میں افسانہ پڑھنا تھا۔ عینک حسب نیت گھر پر چھوڑ گئے۔ افسانہ دوسروں سے پڑھایا۔ تلفّظ کی خامیوں کو حکمت عملی کی خوبیوں نے چھپالیا۔

◆❖⌘

قصہ چوتھے ادیب کا

عبیداللہ علیم.....عبیداللہ نام والدین نے رکھا بالکل اسی طرح جیسے ڈاکٹر عبیداللہ خان کا نام والدین نے رکھا تھا' فرق صرف یہ ہے کہ پہلے عبیداللہ نے اپنا تخلص علیم رکھ لیا اور دوسرے نے اپنا تخلص بریانی قرار دیا۔ علیم تخلص اختیار کرنے کا سبب تو سمجھ میں آتا ہے کہ برخوردار میں علم کی کمی رہ گئی ہوگی انہوں نے اس کی تلافی کی لیکن بریانی تخلص میں کس کس کمی کو پورا کیا گیا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔

عبیداللہ علیم کراچی کے شاعر ہیں۔ ان کا خاندان لکھنؤ سے کراچی آیا تھا اور ''کرسی'' ساتھ تھی یا نہیں، اتنا ظاہر ہے کہ کرسی سے ان کا کوئی نہ کوئی ذہنی تعلق ضرور ہے کیونکہ کرسی سے انہیں خاص لگاؤ ہے۔ گلڈ کی کرسی پر انہیں کا حکم چلتا ہے۔ لاہور میں ان کی آمد بھی گلڈ کی تقریبات کے سلسلے میں رہتی ہے۔ انعام کا معاملہ ہو یا وظائف کی تقسیم کا' گلڈ کے الیکشن کا ہو یا مرکزی گلڈ پر قبضے کا۔ عبیداللہ علیم کی رائے کا احترام بہرحال ضروری ہے کیونکہ ان معاملات کا تعلق علم سے کم اور سیاست سے زیادہ ہے۔ عبیداللہ علیم کی کامیابی کا یہ حال ہے کہ کراچی میں ان کے دوستوں کا ڈنکا بجتا ہے اور ڈنکا بجانے والوں میں ہمارے نواب جمیل اختر خان سب سے آگے ہیں کیونکہ وہ

بہ انحصار عہدہ ادیب ہیں اور ان کا عمر بھر کا سرمایہ ہی دو چار عہدے ہیں۔ ادب میں ڈنکے بجانے کا کام ان کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ یونیورسٹی میں بھی یہی محکمہ ان کے سپرد ہے۔ کراچی یونیورسٹی میں دو قسم کے استاد ملتے ہیں۔ ایک وہ جو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں دوسرے وہ جو صرف پڑھاتے ہیں اور پڑھنے کا کام ان کے شاگرد کرتے ہیں۔ ہمارے نواب جمیل اختر خان اس دوسری اساس پر فائز ہیں۔ کراچی یونیورسٹی کے بارے میں تو یہ اطلاع عام ہے کہ سال میں دس گیارہ مہینے بند رہتی ہے اور ایک آدھ مہینہ کھلتی ہے۔ جب کھلتی ہے تو جمیل اختر خان یونیورسٹی کا کام کرتے ہیں جب بند ہوتی ہے تو یونیورسٹی ان کا کام کرتی ہے۔ میں انہیں ہر مہینہ تنخواہ دے جاتی ہے اور کراچی میں گھومنے پھرنے کی پوری چھٹی دیتی ہے۔ خوب سج سجا کر نکلتے ہیں۔ سفید اچکن، سفید کرتہ، سفید چوڑی دار پاجامہ، آپ نے لکھنؤ کی نواب تو دیکھے ہوں گے بس انہیں کا ناک نقشہ ہے۔ لکھنؤ سے ان کا تعلق تو واجبی سا ہے وہ اس طرح کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے شاگرد رہ چکے ہیں اور انہوں نے سن رکھا ہے کہ استاد نے لکھنؤ کے دبستان شاعری پر کچھ لکھا تھا۔ کیا لکھا تھا؟.....اس کی خبر تو ان کے استاد کو بھی نہیں۔ تاہم شاگرد ہونہار ہے۔ اس نے استاد سے سیاست بھی سیکھی اور خودستائی کی عادت بھی۔ دونوں کے طفیل کراچی کی اعلیٰ سوسائٹی میں ان کی مانگ بہت ہے۔ کوئی ادبی محقق ہو، کسی کے بیٹے کی سگائی ہو، کبھی کسی کے گھر پر نیاز ہو، کسی کے بیٹے بیٹی کی منگنی ہو یا عقیقہ ہو تو عام رواج کے مطابق ادیبوں اور شاعروں کو دعوت دی جاتی ہے۔ جمیل اختر خان بھی ان محفلوں میں بلائے جاتے ہیں اور داد فن پاتے ہیں۔ کبھی کبھی ٹیلی ویژن والوں کو بھی ضرورت پڑ جاتی ہے اور انہیں پروگرام میں شامل کر لیتے ہیں کیونکہ یہ تالی اچھی بجاتے ہوں اور ٹیلی ویژن کا سارا کاروبار ہی تالی بجانے اور تالی بجوانے پر مشتعل ہے۔ کتابوں کے تبصرے ہیں تو جمیل اختر خان کے حصے میں آتے ہیں اور مشاعرے کی ضرورت ہو تو عبیداللہ علیم سے کام چلایا گیا جاتا ہے۔

عبیداللہ علیم اپنے کو میر ثانی کہتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ میر جملہ ثانی نہیں کہلاتے ورنہ انہیں بھی میر جملہ کی طرح ہر جائی پن کا مرض ہو جاتا اور کوچہ کوچہ کالم لکھتے پھرتے۔ علیم بیچارے لے دے کر اپنے آپ کو میر ثانی کہتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ خیر کہہ لیں ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے آخر کراچی میں ایک گلوکارہ ٹینا ثانی بھی تو ہے۔

◆❖⌘

(۳)

میر جملہ لاہوری کے کالم

سرقہ یا توارد

پہلے ہم نے قیوم نظر کی تصویر کا دوسرا رخ دکھایا تھا' اس بار ہم انیس ناگی کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ ہمارے عزیز انیس ناگی کثیر المطالعہ آدمی ہیں اور قدیم و جدید دونوں قسم کے ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون ''نوائے وقت'' میں شائع ہوا ہے' اس میں انہوں نے ایک دوسرے مشہور ادیب کی تحریر کے بارے میں اصل متن کا حوالہ بھی دیا جس پر مواد مبنی تھا۔ اس پر بہت واویلا ہو رہا ہے۔

ادب میں اس طرح کی تحریروں کی دریافت کچھ نئی نہیں۔ اس سے پہلے معروف ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں کے اصل انگریزی متن شاہکار ادبی کتاب بکف چراغ دارد' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کول نے اپنی کتاب ''نیا ادب'' میں کرشن چندر کے دیباچے کا اصل ڈھونڈ نکالا تھا جو ''ماورا'' کے دیباچے کے طور پر شائع ہوا تھا۔ مضمون کا بہت چرچا ہوا۔ دوسرے مشاہیر کے کارناموں کو'' بکف چراغ دارد'' ہی کے نام سے ممتاز لیاقت نے کئی برس ہوئے لاہور سے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ ایسی تحریریں ''ظالمانہ'' تو ضرور ہوتی ہیں لیکن ان کا ایک فائدہ بھی ہوتا ہے کہ لکھنے والے آئندہ احتیاط برتنے لگتے ہیں اور اس طرح کی

''چربہ فلمیں'' تعداد میں کم ہو جاتی ہیں۔ ناگی اورینٹیل کالج کے تربیت یافتہ ہیں، اس لئے ان کے ہاں بھی یہاں کے محققین والی شدت آ جاتی ہے لیکن انیس ناگی کی صاف گوئی بے رحمی کی حدوں کو چھوتی ہے تو ادبا خفا ہو جاتے ہیں۔ انیس ناگی اس لحاظ سے تو اچھا دیب ہے کہ لگی لپٹی کے بغیر اپنی رائے کا اظہار کر دیتا ہے اور اس کی رائے دوسروں کی رائے پر مبنی نہیں ہوتی۔ اس میں اس کی انفرادیت ہے لیکن ادب میں چونکہ ابھی تک کوئی ''ادارہ انسداد بے رحمی'' قائم نہیں ہوا اس لئے انیس ناگی اورینٹل کالج والوں کو روکنا ممکن نہیں۔ اگر انیس ناگی اپنے مزاج میں ذرا سا تحمل اور ذرا سی احتیاط پیدا کر لے تو ان کی آراء کی قدر بھی زیادہ ہوگی اور وہ شدید ردعمل سے بھی محفوظ رہیں گے۔

پرانے زمنے میں چراغ سے جلتا تھا اور اسے جائز سمجھا جاتا تھا۔ نقاد اسے ''صنعت ترجمہ'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ عربی کے شعر کو فارسی اور فارسی کے شعر کو اردو میں بیان کر دیا تو یہ صنعت کہلائی اور شعر کی خوبی تصور کی گئی لیکن ایک ہی زبان کے شعر کا اس زمانے میں دوسرے شاعر کی زبان پر آ جاتا سرقہ یا توارد کہلاتا تھا۔ ان جانے میں وہی بات دھرائی جائے تو توارد کہلاتی ہے اور عمداً کی جائے تو سرقہ۔ گویا سرقہ اور توارد میں نیّت کا باریک سا پردہ حائل ہے۔ مرزا غالب نے تو یہ پردہ بھی درمیان سے اٹھا دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ تو بڑے بڑے شاعر جو مجھ سے پہلے ہوئے ہیں یہی مضمون باندھ گئے تو یہ ان کی طرف سے سرقہ تھا کیونکہ ''نہاں خانۂ ازل'' میں میرے جو مضمون محفوظ تھے وہ انہوں نے چرا لئے تھے اور میرے نوک قلم پر آنے سے پہلے ہی میری ''متاع عزیز'' کو اڑا لے گئے۔ ہوسکتا ہے یہاں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہوا ہے کہ پرانے لکھنے والے ہی سرقے کے مرتکب ہوئے ہوں اور ہمارے معاصر ادیب خواہ مخواہ یہ نام لئے جا رہے ہیں۔ اور پھر فرق بھی ایسا کون سا بڑا ہے، آپ اسے سرقہ کہتے ہیں لیکن میں اسے توارد کہتا ہوں۔ محض لفظوں کی بات ہے اور لفظوں کا کیا اعتبار۔

ایک بار مارک ٹوئین نے کسی سائنسدان کے تحقیقی مقالے کی صداقت کی اور آخر

میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ حضرات اس مقالے میں کوئی نئی بات نہیں یہ سارے کا سارا مقالہ لفظ بلفظ ایک کتاب سے نقل کیا گیا ہے۔ لوگ چونکے اور پوچھا کہ کون سی کتاب؟ جواب تھا آکسفورڈ انگلش ڈکشنری'' اب آپ اسے کیا کہیں گے.....سرقہ؟ یا توارد؟ وہی نہاں خانہ ازل والی بات۔ اس میں خفا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ انیس ناگی تو ایک ادبی فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

◆❖⌘

گھوڑے اور گھوڑوں کے معالج

آج کل اخبارات میں ادیبوں کے انٹرویو باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ انیس ناگی اور قیوم نظر کے انٹرویو کی بڑی دھومیں ہیں۔ دونوں ادیبوں کی خاص خوبی یہ ہے کہ چونکا دینے والی باتیں کرتے ہیں اور دوڑتے ہوئے اپنے پیچھے گرد بہت اڑاتے ہیں۔ اس گرد کی وجہ سے ان کے بیانات لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں حالانکہ ان نیک دل جانداروں کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں ہوتا۔ وہ تفنّس کی خاطر لن ترانیوں کا اظہار تو نہیں کرتے اور لوگ بلا وجہ اور بلا ضرورت ان سے خفا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ معقول آدمیوں کا قول ہے کہ بچوں اور بزرگوں کی باتوں کا کبھی برا نہیں ماننا چاہئے۔

آپ نے ڈربی کے گھوڑے تو دیکھے ہوں گے۔ ہنرمند، چاک و چوبند، منہ زور اور برق رفتار دوڑتے ہیں۔ گرد وہ بھی اڑاتے ہیں لیکن ان کی کوئی بھی مذمّت نہیں کرتا۔ ان پر لوگ داؤ لگاتے ہیں۔ ان کی مٹھی چاپی کرتے ہیں اور انعام جیتنے پر انہیں اپنا ہیرو بناتے ہیں۔ ادب کے یہ ہیرو بھی ڈربی کے گھوڑے ہیں جو راستے میں آئے گا مارا جائے گا۔ ان کے لئے تو میدان خالی چھوڑ دینا ضروری ہے۔ اس میں ان کی کامیابی اور ناظرین کی بقا کا راز ہے۔ البتہ جاکی کی زندگی ہمیشہ خطرے میں رہتی ہے۔ معلوم نہیں کب گھوڑے کا پاؤں رپٹ جائے اور زمین پر آ

رہے۔کب گھوڑا الول کرنے لگے اور سوار کو روند ڈالے۔کب گھوڑا جاگی سے محبت آمیز چھیڑ چھاڑ پر اتر آئے اور اس کا پیٹ چاک کر ڈالے۔انیس ناگی کا گھوڑا یہی ریس کا گھوڑا ہے۔انیس ناگی کا چاکی ہر وہ دوست ہے جو دوسروں کی پَت اتروانے کے لئے انیس ناگی کے کان بھر سکے۔انور سجاد اگر آج شکار ہے تو کل کو جاگی بھی ہوسکتا ہے۔اسے تو بطور فن کار یہ گر بھی آتا ہے۔اب اسے کمزور گھوڑے سے اتر کر انیس ناگی پر سوار ہونا پڑے گا اور اس کی مٹھی چاپی کرنی پڑے گی۔آخر وہ ڈاکٹر ہے انسانوں کے علاوہ گھوڑوں کا علاج بھی کرسکتا ہے۔گرمیوں میں گھوڑا لاہور کی تپتی ہوئی سڑکوں پر توازن کھو بیٹھتے ہیں تو ان کے لئے علاج معالجے کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ڈاکٹر انور سجاد تو یوں بھی ادیبوں کا علاج مفت کرتے ہیں کہ یہ کار خیر بھی ہے اور گھوڑوں کی برادری کا باہمی حق بھی۔لیکن اس گھوڑے کا علاج اس کے بس میں نہیں کہ گھوڑے کے ماتھے پر جلی حروف میں ''ناگی'' لکھا ہوا ہے۔انور سجاد گھوڑوں کے معالج ہیں۔سانپ کے کاٹے کا علاج نہیں جانتے۔ان کی اس علاج فہمی کی وجہ سے ان کے پالے ہوئے گھوڑے اکثر سائیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔سعادت سعید، مبارک احمد، شاھد ندیم کے گھوڑے انور سجاد ہی کے تیار کردہ تھے۔بالغ ہوئے تو اپنی ہی جنس کو کھانے لگے۔یہ تو سب پالتو گھوڑے تھے۔ڈربی کے گھوڑوں کی بات دوسری ہے۔انیس ناگی پالتو ادیب نہیں۔وہ وتو جنگل کا بادشاہ ہے اور کھلی فضاؤں میں گھومنے پھرنے کا عادی ہے۔اسی میں اس کی صحت کا راز مضمر ہے۔

قیوم نظر شیر کی طرح دھاڑتے ہیں لیکن چڑیا کا دل رکھتے ہیں۔کبھی ادب برائے ادب کے قائل تھے، اب ''چھیڑ چھاڑ برائے چھیڑ چھاڑ'' کے قائل ہیں۔ورنہ کسی کی دل آزاری ان کا مقصد نہیں ہوتا۔بس ذرا نشتر بعض اوقات ذرا گہرا لگا بیٹھتے ہیں۔اس کے مقابلے میں انیس ناگی کا مقصد ہی دوسروں کو اذیت دینا ہوتا ہے لیکن عجب بات ہے لوگ ان کے بارے میں بالکل سیریس نہیں ہیں۔وہ ان کی شمشیر زنی کو ہنسی میں اڑاتے ہیں اور ان کی کسی بات کا برا نہیں مانتے۔آخر برا

بھی کبھی مانیں، جس شخص کو پتہ ہی نہ چلتا ہو کہ اس کے آس پاس کی دنیا کیا سوچتی ہے ایسے ''اللہ لوک'' کو پبلک کیوں نہ معاف کر دے۔

اس زمانے میں جب کہ ہر بس ڈرائیور کو تین تین قتل تک معاف ہیں اور آئے دن سڑکوں پر تیز رفتاری سے انسانی خون بہتا رہتا ہے، تنقید کے میدان میں بھی اناڑی ڈرائیوروں کو کم از کم دس دس ادیبوں کا خون تو معاف ہونا بھی چاہئے۔

''تو مشق ناز کو خون دو عالم میری گردن''

◆❖⌘

محتسب رادرون خانہ چہ کار

ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ لوگ قیوم نظر کے پیچھے خواہ مخواہ پنجے جھاڑ کر پڑ گئے ہیں۔ جب ''نوائے وقت'' میں اکبر ملک کا مضمون شائع ہوا تھا اور ہمارے بعض دوستوں کو انہوں نے ''تربوزی'' کہا تھا تو کسی نے آواز نہیں اٹھائی تھی۔ قیوم نظر ''اندر سے سرخ اور باہر سے سبز'' کہہ رہا ہے تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ حالانکہ طوفان کا اصل وقت وہی تھا جب بارش کا پہلا قطرہ گرا تھا لیکن اس کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ جب معاملہ رشتہ داری کا ہو تو لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے اور موسم کا کیا ہے وہ تو بدلتا ہی رہتا ہے۔ اس سائنس کے زمانے میں مصنوعی بارش بھی کی جا سکتی ہے اور اولے بھی برسائے جا سکتے ہیں۔

پاکستان میں تو بے وقت کی بارشیں ہوتی رہتی ہیں۔ اب معمولی سے جھڑی لگتی ہے تو لاہور کے گلی کوچے جل تھل ہو جاتے ہیں اور ادب کی ٹریفک رکتی نظر آتی ہے۔ ماڈل روڈ کا ٹی ہاؤس چوک میکلوڈ روڈ کا لکشمی چوک، سمن آباد اور کرشنا نگر کی گلیاں ان کی رونق بارش کے دم سے ہے۔ لاہور کے تمام نشیبی علاقے بارش کے دم قدم سے آباد ہیں۔ ان کے مکینوں کی رونق بارشوں کی وجہ سے ہے۔ بلکہ ان علاقوں کی شہرت ہی اس وجہ سے ہے کہ جب ذرا چھینٹا پڑا ان بستیوں کی

قسمت جاگ اٹھی۔اخباروں میں تصویریں چھپیں۔شہریوں کی انجمن نے ٹی پارٹیاں کیں۔اخبار نویسوں کو بلایا اور لاہور کارپوریشن اور ایل ڈی اے کے خلاف بیان دیئے' اخباروں نے بڑی بڑی سرخیاں لگائیں۔ ان آبادیوں کی مشکلات کا تذکرہ کیا۔گورنر صاحب کے دورے کی خبریں چھپیں۔پانی اتر گیا۔مشکلات خود بخود حل ہوگئیں۔

بارش کا پانی کھڑا ہو تو راہگیروں کی شامت بھی آتی ہے۔تانگے اور موٹریں پانی میں رک جاتے ہیں تو بچے انہیں پیسے لے کر دھکیلتے ہیں یا پھر آس پاس جمع ہو کر چھینٹے اڑاتے ہیں اور ساون کی جھڑی کا مزا اُڑاتے ہیں،بعض ہنرمند نہاتے ہیں یا پانی میں تیرتے ہیں،بعض کاغذ کی کشتیاں چلاتے ہیں۔یہی نہانے اور کشتیاں چلانے والے نسل دو چار برس میں جوان ہو کر اخباروں کے دفتروں میں جا پہنچتی ہے اور ادبی رپورٹر کہلاتی ہے۔ادبی بارشیں زوروں پر ہوں تو ان کا کاروبار چمکتا ہے۔کسی سے بیان لیا' کسی کے بیان پر حاشیے چڑھائے۔کسی کو پانی جھکول جھکول کر تر کر دیا' کسی کے تانگے میں جُتے گھوڑے کو بھڑکا دیا۔کسی کے سر سے ٹوپی اتار کر کشتی بنائی اور تیرتی ٹوپی پر تالیاں بجا بجا کر خوش ہو گئے۔کسی دھکا سٹارٹ گاڑی کو دھکا لگانے کی اجرت وصول کی اور اسے گہرے پانی سے پار کرا دیا۔غرض کہ ساون میں لاہور کے کیا کہنے ہیں۔

نئی گاڑیاں تو فرّاٹے بھرتی، چھینٹے اُڑاتی، گہرے پانیوں سے خود ہی نکل جاتی ہیں۔مشکل پرانی گاڑیوں کی ہے۔بعض پرانی اور عمر رسیدہ گاڑیاں شور زیادہ کرتی ہیں،چلتی کم ہیں۔قیوم نظر کی گاڑی اسی طرح کی ہے۔بعض دھواں دیتی ہیں۔جیسے اشفاق احمد کی گاڑی لیکن بعض دانا اور پختہ عمر کے ادیب مالک اپنی کاروں میں دو چار جواں ادیب بھرتی کر کے ساتھ رکھتے ہیں۔جانے کب انجن بند ہو جائے اور گاڑی کو دھکے لگا کر پانی سے نکالا جائے۔راستوں کے لڑکوں کا کیا اعتبار دھکا لگانے سے انکار کر دیں اور پیسے لے کر مکر جائیں یا اپنی اجرت بڑھانے کا مطالبہ کر دیں۔بہتر ہے کہ اپنے اپنے مستقل دھکا لگانے والے ساتھ رکھنے چاہیں تا کہ وقت بے وقت گاڑی کو چالو رکھ سکیں۔لاہور کے بیشتر بزرگ ادیبوں کا یہی طریق کار ہے۔اب دیکھئے وزیر

آغا نے جوانی میں ہی اپنی لمبوتری گاڑی کو دھکا لگانے کے لئے انور سدید کو ہر وقت ساتھ رکھتے ہیں۔ جس ملک میں ادیبوں کی شہرت کی عمر دو چار برس سے زیادہ نہ ہوتی ہو وہاں اپنی ساکھ اور شہرت برقرار رکھنے کے لئے ہر اخبار میں ایک آدھ ''اپنا آدمی'' تو رکھنا ہی پڑتا ہے اور اگر دو چار ''اپنے آدمی'' ہر محاذ پر ہوں تو عزت محفوظ رہتی ہے۔ اس دانشمندی کا مظاہرہ احمد ندیم قاسمی صاحب نے خوب کیا ہے۔ خود بھی اخبار میں کام کرتے ہیں، دوسرے اخباروں میں اس نے آدمیوں کو رکھا ہوا ہے۔ قیوم نظر ٹھہرے دیہاتی آدمی' انہوں نے یہ دیکھے بغیر ہل چل مچا دی کہ اخباروں میں ان کا کوئی ''اپنا آدمی'' ہے بھی یا نہیں۔ کراچی میں تو خیر انہیں مدد مل ہی جائے گی۔ مشفق خواجہ اچھے آدمی ہیں اور ہر مظلوم کی مدد کرتے ہیں' لیکن لاہور میں یہ محاذ کون سنبھالے گا؟ اس ترقی کے زمانے میں اولاد کسی کے کام نہیں آتی۔ سلمان بٹ کے تو ابھی کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ جوان ہوگا تو باپ دادا کا نام روشن کرے گا۔ خود کھائے گا دوسروں کو کھلائے گا۔ باپ دیکھ دیکھ کر خوش ہوگا۔ لیکن اس وقت محاذ خالی ہے اور دوسری طرف ادیبوں کی پوری فوج لاہور کے گلی کوچوں میں محنت کر رہی ہے اور دشمن کی تلاش میں ہے۔ واپسی پر قیوم نظر کو خاصا مقابلہ کرنا ہوگا۔

یہاں تک تو ہمارے دوست کی باتیں تھیں۔ اب آگے ''میر جملہ'' کہتا ہے کہ بھائی تمہاری سب باتیں سچی۔ تمہارا ہر بیان درست؟ لیکن ہم دخل دینے والے کون ہوتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی بھی کشمیری' قیوم نظر بھی کشمیری ان کی لڑائی ذات برادری کی لڑائی ہے۔ ہم پرانے پھٹے میں کیوں ٹانگ اڑائیں۔ ہاں امجد اسلام امجد کا نام نہیں لیتے، وہ کباب میں ہڈی ہے۔ ''اسلام'' کو بھی دبوچ رکھا ہے۔ (نعوذ باللہ)

◆❖⌘

ادب کا ہفتہ شجر کاری

بہار کی آمد آمد ہے۔ ملک میں شجر کاری کا ہفتہ زوروں پر ہے۔ ادب میں بھی بہار کی آمد ہے۔ یہاں بھی ہفتہ شجر کاری کی ضرورت اور اہمیت کو ادیبوں اور شاعروں نے شدت سے محسوس کر لیا ہے۔ جب سے ادب میں جمود کا نعرہ لگا ہے تخلیقی صلاحیتوں کے سوتے خشک سے ہو چلے تھے۔ اسی خشکی کو دور کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر ہفتہ شجر کاری منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

اگر چہ درختوں کی کمی کو پورا کرنے میں محکمہ زراعت اور محکمہ تعلیم دونوں مشترکہ منصوبوں کے تحت ''چمن بندی'' میں مشغول ہیں اور درختوں کی سرکشی کو ختم کرنے کے لئے ''آواستن'' سے زیادہ ''پیراستن'' پر کمربستہ ہیں اور یہ بھی ہے کہ جھاڑ جھنگار صاف کرتے ہوئے بعض اوقات درخت بھی صاف کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ کوششیں کسی بڑے پروگرام کا حصہ نہیں ہیں۔ ہاں بعض ادیب انفرادی طور پر شجر کاری کی خدمت بہتر طور پر انجام دے رہے ہیں اور اپنے طور پر ''سر توڑ کوششوں میں مصروف ہیں۔ اکثر اخبارات کے صفحات پر ایک دوسرے کا سر توڑنے میں لگے ہوئے ہیں لیکن اس سے ادب کی دنیا سرسبز اور شادب ہوتی نظر نہیں آتی۔

اس کیلئے تو پوری قوم کو مصروف عمل رکھنے کی ضرورت ہے، ورنہ قوم خود بخود بھی مصروف عمل ہو جاتی ہے۔ اسی کے نتیجے میں سیاسی سرگرمیاں سر اٹھاتی ہیں اور سیاست دان کسی فارمولے اور غیر متفق ہونے کے لئے باہمی تنازعات شروع کر دیتے ہیں اور پھر بیانات کی تازہ فصل کے سوا کھیتوں میں کچھ نہیں اگتا، سچی بات تو یہ ہے کہ سیاسی شجر کاری سب سے زیادہ مشکل اور صبر آزما کام ہے اس لئے ہمیں اکثر مالی بھی بدلنے پڑتے ہیں اور باغبان بھی نئے نئے لانے پڑتے ہیں کیونکہ شوق باغبانی اور ذوق نثر چینی ہماری سیاسی جدوجہد کا حاصل ہے۔ ادب کی دنیا بھی اس قانون سے الگ نہیں۔ چنانچہ یہاں بھی میدان ایک عرصے سے چٹیل ہے، درخت تو کجا اب تو یہاں گھاس بھی نہیں اگتی کہ اسے چھیل کر ادیب گزارا کر لیں۔

شجر کاری کے کئی فائدے ہیں۔ پہلا فائدہ تو یہی ہے کہ اخباروں میں افتتاح کی تصویریں چھپ جاتی ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سردیوں میں لکڑیاں جلانے کے کام آتی ہیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ گھر کا فرنیچر فراہم ہو سکتا ہے۔ چوتھا فائدہ یہ ہے کہ کلچر کی حفاظت ہوتی ہے اور کلچر کی حفاظت ہر پاکستانی کا فرض ہے۔ ادبی شجر کاری کے باقی فائدے تو دوسرے ادیب اٹھاتے ہیں لیکن پاکستانی کلچر کی حفاظت کا فرض ہمارے دوست عطاء الحق قاسمی ایک عرصے سے ادا کر رہے ہیں۔ وہ اپنے طور پر اکثر ادیبوں کی پنیری لگاتے رہتے ہیں۔ آدمی بے غرض ہیں انہیں اس سے واسطہ نہیں کہ یہ پودے آگے چل کر پھول بھی لائیں گے یا نہیں۔ یوں تو پوری قوم کو یہ فکر نہیں کہ کوئی پودا پھل بھی لگاتا ہے یا نہیں۔ ہم ہر سال ہفتہ شجر کاری مناتے ہیں۔ اگر حاصل سے غرض ہوتی تو اب تک پورا ملک جنگل میں تبدیل ہو چکا ہوتا اور ہم جنگل کے قانون کے تحت زندگی بسر کرتے اور یہی قانون ہمارا ملکی دستور ٹھہرتا۔ اس کے علاوہ اگر ملک جنگل میں تبدیل ہو جاتا تو انسانوں کو زمین کی بجائے درختوں پر بسیرا کرنا پڑتا، چونکہ ہمیں درختوں پر بسیرا پسند نہیں اس لئے ہم تو درخت لگا کر صرف ان کے مرجھانے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے عطاء الحق قاسمی بھی اس ''قانون قدرت'' سے باہر نہیں ہیں۔ انہیں درسی کتاب کا وہ سبق اچھی طرح یاد ہے کہ دادا

درخت لگاتا ہے اور پوتا پھل کھاتا ہے۔ اسی توقع پر وہ ادیبوں کی شجر کاری کرتے ہیں اور پوتوں کے انتظار میں بوڑھے ہوتے جاتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی لمبی قلموں کا راز یہی ہے کہ وہ بہت بڑے باغبان ہیں۔ کبھی چھوٹے باغبان تھے اس زمانے میں ان کی قلمیں چھوٹی تھیں۔ اس دور میں انہوں نے گلزار وفا چودھری کی قلم لگائی تھی۔ اب قلمیں لمبی رکھتے ہیں اس لئے پودے بھی بڑے بڑے لگاتے ہیں اور بعض اوقات تو پورے کے پورے درخت دوسروں کے باغات سے اٹھا کر لے آتے ہیں اور اپنے باغ میں لگا کر اس کی چھاؤں کا لطف اٹھاتے ہیں۔

◆❖⌘

نئے سال کے خطابات

یادش بخیر حکیم یوسف حسن مرحوم بڑے مزے کے آدمی تھے۔کبھی ''دوشیزہ'' لکھ رہے ہیں' کبھی ''نیرنگ خیال'' چھاپ رہے ہیں' کبھی ادیبوں کو سال بہ سال خطابات سے نواز رہے ہیں۔ یہ خطاب نیزنگ خیال میں نمایاں طور پر شائع ہوتے تھے۔راشد الخیری کو ''مصورغم'' کا طاب بھی انہوں نے دیا تھا۔

ہم نے سوچا اور مرد عظیم کی بعض روایات کو زندہ رہنا چاہئے۔دوشیزہ کی روایت ٹی وی والوں نے اپنا لی' نیرنگ خیال کو ایک عرصے سے سلطان رشک زندہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں' کیوں نہ ہم خطابات والے کام کو آگے بڑھائیں۔اب تو حکیم صاحب کے خطاب یافتہ خال خال ہی زندہ ہیں اور موجودہ نسل بے خطاب ہی جا رہی ہے۔ یہ بحران عالمی سطح پر بھی دیکھنے میں آ رہا ہے۔شاید اسی لئے اکثر سربراہان مملکت آج کل اپنی اپنی قوموں سے خطاب کی ضرورت اکثر محسوس کرتے رہتے ہیں۔ بہرحال پاکستان کی حد تک ہمیں اس کی روک تھام ضرور کرنی چاہئے کہ یہ نسل خطابات سے خالی نہ چلی جائے۔ظلم تو یہ ہے کہ کوئی ادارہ بھی یہ خدمت انجام نہیں دے رہا' جو اکا دکا خطاب والے دکھائی دیتے ہیں ان کے لئے پبلک

بے چاری کو خود ہی خطابات کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔نور جہاں کو ''ملکہ ترنم''، جوش ملیح آبادی کو ''شاعر انقلاب'' اور کشتی رانی میں کامیابی حاصل کرنے والی خاتون کو ''ملکۂ بحر'' کہا جاتا ہے۔ یہ کسی مستند ادارے کے عطا کردہ ایوارڈ نہیں۔ یہ کوئی مستحسن بات نہیں۔جعلی ڈگریوں کی بات دوسری ہے ان کی مانگ تو دوسرے ملکوں میں بہت ہے اس لئے جاری رکھنے کا جواز بھی ہے لیکن یہ جعلی خطابات والا معاملہ مختلف ہے۔اب تو اس ملک میں اصلی خطاب یافتہ دو چار ہی رہ گئے ہیں۔ایک بزرگ مصور فطرت ایم اسلم ہیں۔ دوسرے ادیب الملک سید امجد الطاف ہیں اور تیسرے ہمارے قومی ترانے والے حفیظ جالندھری ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ احسان دانش کو ''شاعر مزدور'' کا اعزاز حکیم صاحب نے دیا تھا یا وہ کاندھلے سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ حفیظ جالندھری کے بارے میں حتمی طور پر معلوم ہے کہ ان کے ساتھ خطاب والی دل لگی یوسف حسن ہی نے کی تھی۔ہم تو حفیظ صاحب کے نیازمند ہیں اور ان کے تازہ کلام تک کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اب تو ہمارے ''ابو الاثر'' عمر کے اس حصے میں ہیں کہ ''اثر'' رخصت ہو چکا ہے اور خالی ''ابو'' ہو کر رہ گئے ہیں۔ باقی رہے سید امجد الطاف تو وہ حکیم صاحب کے زمانے میں افسانہ نگار تھے اب شاعر ہیں ان کا خطاب ادیب الملک پرانا ہو گیا ہے اسے ری کنڈیشن کرنے کی ضرورت ہے۔ان کے علاوہ دو چار اور بھی دوست ہیں جو بلاوجہ ''بے خطاب ہی'' جہانِ گزراں سے کوچ کرنے والے ہیں۔خطاب کے بغیر تو ان کا جنازہ بھی حلال نہیں ہوگا۔ایسے میں خطابات کو جاری کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ ویسے بھی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہے، شاید خطابی سرگرمیاں اس کی کچھ تلافی کر سکیں۔اس لئے ہم نے خطابات کی تقسیم کا ڈول ڈالا ہے۔لیکن ایک شرط کے ساتھ۔امسال محکمہ تعلیم پنجاب کے کسی ملازم ادیب' یا شاعر کو خطاب نہیں دیا جائے گا بلکہ ان کے نام بھی صیغہ راز میں رکھے جائیں گے کیونکہ ان پر آفت ٹوٹنے والی ہے۔''ادبی نس بندی'' کی افواہ اڑی ہوئی ہے۔ سنا ہے کہ لکھنے کے لئے رجسٹریشن بھی کرانی پڑے گی اور شاید لائسنس بھی لینا پڑے۔اس لئے ان کا ''قصہ چھوڑ کر باقی

ادیبوں کی خطاب حاضر ہیں''۔

رئیس امروہوی	ادب کا پریشر ککر
مشکور حسین یاد	ادب کا نثار قادری
مظفر محمد علی	صحافت کی پھولوں دیوی
گلزار وفا چودھری	عطاء الحق قاسمی کا سپیئر پارٹ
عبدالعزیز خالد	صاحبِ عزیز اللغات
ڈاکٹر وزیر آغا	شہنشاہِ انشائیہ
مشفق خواجہ	شرلک ہومز
انور سدید	انشائیہ کی سٹپنی
حبیب جالب	جنگل کنگ
فیض احمد فیض	ادب کا گونگا پہلوان

◆❖⌘

نئے سال کی پیشین گوئیاں

ہمارے نجومی خاص منجم الملک پیراں دتہ بسمل نے نئے سال کے بارے میں چند پیشین گوئیاں کی ہیں۔فرماتے ہیں۔

اس سال اردو ادب میں کئی انقلابی تبدیلیاں ہوں گی۔انشائیے کا زوال شروع ہو جائے گا۔اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے مشکور حسین یاد اور ڈاکٹر وزیر آغا مل کر حمایت میں بیان دیں گے، ان کو کمک انور سدید پہنچائیں گے، تاکہ دوسرے انشائیہ نگار بھی اس فکری محاذ میں شامل ہوسکیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں وزیر آغا پر ایک مستقل باب باندھیں گے نیز انشائیے کے بارے میں اپنے سابقہ خیالات سے روگردانی کا اعلان فرمائیں گے۔

نثری نظم کی حمایت میں ڈاکٹر سید عبداللہ مولانا حامد علی خان اور رئیس امروھوی بیان دے کر اسے اردو کی ایک مستقل صنف قرار دیں گے۔

ظہیر کاشمیری کے گھر دو جڑواں بچے پیدا ہوں گے جن کے ماتھے پر اللہ اور محمد کے الفاظ درج ہوں گے اور دور دور سے لوگ دیکھنے آئیں گے۔فیض احمد فیض بھی غیر ملکی دورہ منسوخ کر

کے واپس پاکستان آئیں گے اور بچوں کے کانوں میں اذان دیں گے۔ وہ اپنا نعتیہ کلام بھی شائع کریں گے جس کی تقریب منائی جائے گی' جلسے کی صدارت احمد ندیم قاسمی فرمائیں گے اور نسیم حجازی اور مولانا نعیم صدیقی مقالے پیش کریں گے۔

عطاء الحق قاسمی اپنے اخبار میں احمد ندیم قاسمی کے خلاف کالم لکھیں گے اور ''اردو ادب کے بیس خاندانوں کا کچا چٹھہ دوبارہ شائع کریں گے''۔

عطاء الحق قاسمی کا سفر نامہ ''شوق آوارگی'' امسال شائع ہوگا جس کا انتساب عطا شاد کے نام ہوگا ''معاصر'' اس سال بھی شائع نہیں ہو سکے گا تاہم ''تخلیقی ادب'' والے مشفق خواجہ پیغام بھیجیں گے کہ وہ کتابت شدہ کاپیاں انہیں بھیج دیں تاکہ تخلیقی ادب کی تیسری جلد کے طور پر شائع کیا جا سکے مگر عطاء الحق اس پیشکش کو ٹھکرا دیں گے اور فیروز سنز سے بات چیت کریں گے جو کامیاب نہیں ہوگی۔ مایوس ہو کر وہ اسے ایم اے او کالج کے رسالے ''اقرا'' میں خاص نمبر کے طور پر شائع کریں گے۔ احمد سعید پرچے کا مسودہ جمع کرنے' کتابت اور طباعت کے مراحل کی مفصل تاریخ لکھیں گے جسے ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کتابی صورت میں شائع کر دے گی۔ اس کتاب پر تبصرہ پاکستان کے ریڈی میڈ مؤرّخ شیر محمد گریوال کریں گے۔ اس سال رسائل کے ''گریوال نمبر'' بھی شائع ہوں گے۔ اخبارات خصوصی فیچر اور رنگین تصاویر بھی شائع کریں گے خاص طور پر سکھوں کے پیغامات نمایاں طور پر چھاپے جائیں گے۔ یہ پیغامات سبط الحسن ضیغم اپنے قلم سے لکھ کر اخبارات کو دیں گے۔

پروفیسر وارث میر ڈاکٹر مسکین علی حجازی کو شعبہ صحافت کا نائب صدر مقرر کریں گے اور خود فریضہ حج ادا کرنے جائیں گے۔

''اکیڈمی آف لیٹرز'' کا دعوت نامہ نہ ملنے پر مایوس ادیب و شاعر اپنا الگ ادارہ قائم کریں گے جو ملک کے نامور ادیبوں کو بھاری تعداد میں دعوت نامے جاری کرے گا اور سرکاری

خرچ پر مایوس ادیبوں کے لئے آخری آرام گاہ تعمیر کرنے کا ضمیمہ تیار کر کے حکومت کے سامنے پیش کرے گا۔

مقتدرہ قومی زبان اس سال اردو کے فروغ کے لئے کاغذی کارروائیاں مکمل کر لے گا اور ان پر عملدرآمد کے لئے بھی تگ و دو شروع کرے گا۔ الحمدللہ اب دفاتر کا ضروری سامان از قسم نائب قاصد صوفے اور دیگر فرنیچر' کراکری' فرج اور ایئر کنڈیشنر بڑی تعداد میں آ گئے ہیں اور کاروں کی معقول تعداد بھی آ چکی ہے۔ اب سارا عملہ دلجمعی سے غور و خوض کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔

◆❖⌘

پاکستانی چمچوں کی صنعت

چمچوں کی کئی قسمیں ہیں۔ پلاؤ کھانے کے چمچ، کھیر کھانے کے چمچے، ٹیڑھی کھیر کھانے کے چمچے، سالن کے چمچے، ڈونگوں کے چمچے، اچار کے چمچے، گرم مصالحے کے چمچے، چپک جانے والے چمچے، گن گانے والے چمچے، سرکاری چمچے، غیر سرکاری چمچے، دیسی چمچے، امریکی چمچے، سٹین لیس سٹیل کے چمچے، ٹین کے چمچے، خام لوہے کے چمچے اور لکڑی کے چمچے، ادیبوں کے چمچے۔ اسی طرح چمچیوں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ سائز اور ہر فیشن کی چمچیاں بھی دستیاب ہیں۔ سب سے زیادہ مفید کاروبار ادبی چمچوں اور چمچیوں کا ہے۔ بڑا ادیب دراصل بڑا صنعت کار ہے اور اس کی فیکٹری میں خاص خاص برانڈ کے چمچے بنائے جاتے ہیں۔ لاہور میں اب یہ صنعت بہت مقبول ہے اور مال دساور کو بھی بھیجا جاتا ہے۔ کاری گروں کا کمال یہ ہے کہ اب انہوں نے دو میں ایک (Two in One) قسم کے چمچے بھی بنا لئے ہیں جو ایک ہی ورکشاپ میں دو دو ادیبوں کے کام آ سکتے ہیں۔ ایسے چمچوں کی قیمت اندرون ملک زیادہ ہے اس لئے بعض ادبی صنعت کاروں نے فیصلہ کیا ہے کہ سادہ چمچے بنانے بند کر دیئے جائیں۔ سنا ہے اس پر ادبی فیکٹریوں میں کام کرنے والے بعض ادبی مزدوروں نے احتجاج بھی کیا ہے اور اسے سرمایہ داروں کے استحصال کا نام دیا ہے لیکن اکثریت نے مالکان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے پاکستان میں یہ صنعت بہت ترقی کرے گی اور رواں مالی سال سے ہمارا

مال دوسرے بڑے ملکوں کے مال کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

مقام شکر ہے کہ پاکستانی کاری گر اب عمدہ مال تیار کرنے لگے ہیں کہ ان پر غیر ملکی مال بہ آسانی دھوکا ہو جاتا ہے۔ بعض غیر ملکی ادبی تاجر پاکستان سے مال لے کر اس پر اپنی مہریں لگا کر فروخت بھی کرنے لگے ہیں۔ یہ مال مہنگے داموں ادب کی باڑہ منڈیوں میں سرعام فروخت ہو رہا ہے۔ ادبی حکومت نے اس سلسلے میں چھاپے مارنے کا وسیع پروگرام بنایا ہے۔ ادبی صنعت وحرفت کی تجارت کے سیکرٹریوں اور ذرائع ابلاغ کی تجارت کے مشیروں کا ایک مشترکہ اجلاس جلد ہی منعقد ہوگا جس میں اہم فیصلوں کا امکان ہے۔ اندرون ملک اس طرح کے جعلی کاروبار کو بالکل بند کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔ اس کے علاوہ بھی ادبی محکموں نے اس صنعت کو قومیانے پر بھی اصرار کیا ہے لیکن ابھی تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا کیونکہ ''وزارت امور ادب'' کا خیال ہے کہ اس سے سرکاری خزانے پر بلا ضرورت بہت بوجھ پڑ جائے گا۔ حکومت جب آرڈر دے کر کسی بھی فیکٹری کے لئے ضرور کارخانے بنوا سکتی ہے تو اسے خود کارخانے چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ سنا ہے بعض بڑے صنعت کار اس صورت حال سے پریشان ہو کر اپنے اپنے مال کی ذخیرہ اندوزی بھی کر رہے ہیں تاکہ بعد میں یہی چمچے بند مارکیٹ میں مہنگے داموں فروخت کئے جا سکیں۔ اس سے مخصوص قلت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اور اس کا اثر ملکی معیشت پر پڑے گا۔

ہوشیار بلیک مارکیٹ کرنے والے ادیبوں کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنے اپنے چمچوں سے غیر ملکی ٹریڈ مارک مٹا کر اس پر اسلامی نشان لگانے میں مصروف ہو گئے ہیں اور اپنا مال کھلی مارکیٹ میں لے آئے ہیں اس لئے ادب کی حکومت راست اقدام کے وقت اس طرح کے واقعات کا بھی سختی سے نوٹس لے گی۔

اکیڈمی آف لیٹرز اور رائٹر گلڈ دونوں ادارے حالات پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہیں اور اس کالے دھندے کو بند کرنے کے بارے میں کسی لمحے بھی مؤثر اقدامات کی توقع ہے۔

◆❖⌘

ادیبوں کا ہفتہ بیماری

اس ماہ کے دوران میں بہت سے ادیبوں نے باری باری ''ہفتہ بیماری'' منایا۔ یہ ہفتہ دانتوں کے درد کا ہفتہ تھا۔ دانتوں کا مرض ادیبوں میں متقدی بیماری کی طرح پھیل چکا ہے۔ اکثر ادیب اور شاعر اپنی اپنی عقل ڈاڑھیں نکلوانے میں مصروف رہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اور مرزا محمد منوّر بھی دردِ دنداں کی شکایت کرتے ہوئے پائے گئے بلکہ اخراج دنداں بھی سننے میں آیا ہے۔ اکثر ادبا و شعراء میں خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے اور کئی ادیب اسلام آباد میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہونے کے امکانات پر غور کر رہے ہیں۔ سنا ہے اسلام آباد میں سی ڈی اے کی طرف سے ادیبوں کی شجر کاری کے لئے زمین خاص طور پر تیار کی جا رہی ہے۔

لاہور میں دانتوں کا مرض شدت اختیار کر چکا ہے اور بہت خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ اگر دانت کھٹے کر دیئے جائیں تو اس سے کس قدر شدت مرض میں کمی آ جاتی ہے لیکن یہ علاج یقینی اور زیادہ مؤثر نہیں بلکہ اس سے کئی Side off effects پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے سیدھے سادے ادیب اس سے گریز کرتے ہیں اور ''فطری'' علاج کو ترجیح دیتے ہیں۔ سنا ہے اس درد کے وائرس کراچی سے لاہور آئے ہیں۔ پچھلے دنوں مشفق خواجہ لاہور پہنچے تو ان پر مرض کا

شدید حملہ ہو چکا تھا جس سے ان کا ایک دانت ٹوٹ گیا۔ وہ تو خیر گزری کہ یہ دانت مصنوعی تھا' اس لئے دوبارہ لگا دیا گیا۔ ورنہ دوسرے ادیبوں کے تو کھانے اور دکھانے کے دانت دونوں ہی اصلی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا نقصان بھی زیادہ ہوتا ہے۔

وبا کی روک تھام کے لئے اکادمی ادبیات اس سال بھی ایک ادبی کانفرنس کا پروگرام بنا رہی ہے۔ اس موقع پر دانتوں کی حفاظت کا ہفتہ خاص طور پر دوبارہ منایا جائے گا۔ اکیڈمی کو یہ حق اس لئے بھی حاصل ہے کہ اس کے سربراہ ایک ڈاکٹر ہیں۔ ستر کے پیٹے میں ہوں گے۔ دانتوں کی نعمت سے یقیناً محروم ہوں گے۔ ویسے بھی طبیعت کے نرم ہیں اس لئے دندان شکنی نہیں کرتے۔ ان کے نائب البتہ اردو محاورے کے مطابق نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت پر عمل پیرا معلوم ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اکادمی ادبیات کا حق ''ہفتہ دانت'' کے علاوہ ''ہفتہ آنت'' منانے کا بھی بنتا ہے۔ کانفرنس کرنے سے ادیبوں کی دانت کی ضرورت پوری ہو نہ ہو آنت کی ضرورت ضرور پوری ہو جاتی ہے۔ لوگ تو خواہ مخواہ گلڈ اور اکادمی ادبیات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ یہ ادارے ادیبوں کے مسائل میں دلچسپی نہیں لیتے۔ ادیبوں کو مژدہ ہو کہ دسمبر میں انہیں پھر اسلام آباد کی دعوت دی جائے گی۔ اللہ رزق میں برکت دے تو نیکی کے کام ہر روز نہیں تو کم از کم سال میں ایک بار تو ہو ہی جاتے ہیں۔ اکادمی ادبیات ادیبوں کے لئے چشم براہ ہے۔

◆❖⌘

اکیڈمی آف لیٹرز کانفرنس

لوہاری دروازے کے باہر تانگوں کے اڈے پر اکثر یہ آوازیں سننے میں آتی ہیں کہ دلی دروازے چلو، ریلوے سٹیشن چلو.....فی سواری چار آنے۔اب ہوائی اڈے پر یہی صدائیں گونجتی ہیں کہ ''اسلام آباد چلو''۔ادیبوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں۔گلابی جاڑا آیا اور اسلام آباد کی قسمت جاگی۔اھل قلم کانفرنس کی افواہیں گرم ہوئیں۔یار لوگوں نے تیاریاں شروع کیں۔مسیح الدین صدیقی ابھی جھنڈیاں ہی باندھ رہے ہیں کہ سکھ یاتری لاہور سے اسلام آباد پہنچنے شروع ہوگئے۔

اہل قلم کون ہے؟ کون نہیں؟ رائٹرز اکیڈمی والے اس باریکی میں نہیں پڑتے۔جس کی جیب میں بال پوائنٹ نظر آیا ادیب ہوگیا۔اگر گنتی میں کوئی کسر رہ گئی تو دو چار ''فن کار'' شامل کر لئے۔قانون ضرورت'' کے تحت دو چار سرکاری افسر بھی ادیب شمار ہو جائیں تو اچھا ہے۔اس سارے اہتمام کے ساتھ کانفرنس کا انعقاد ہو رہا ہے۔ادیب' دانشور اور جملہ اھل وطن اسلام آباد میں جمع ہو جاتے ہیں۔کانفرنس کے بعد اسلام آباد کی رونق دوگنی ہوتی ہے۔ادیب آئندہ سال کا

دعوت نامہ پکا کرنے کے لئے اخباروں میں سفر نامے لکھتے ہیں جنہیں لکھنا نہیں آتا وہ اہل قلم کانفرنس کے منتظمین کی شان میں مکتوبات لکھوا کر اخباروں میں شائع کراتے ہیں۔اپنا مستقبل سنوار لیتے ہیں۔گزشتہ اہل قلم کانفرنس کے بعد سب سے زیادہ مبارک نامے مسیح الدین صدیقی کے لئے چھپے تھے۔

ادیبوں اور دکانداروں کی ہجرت کی وجہ سے کراچی کی گلیاں سونی ہو جاتی ہیں۔سارے شہر میں مشفق خواجہ کے سوا کوئی ادیب باقی نہیں رہتا۔مشفق خواجہ بھی اس لئے پیچھے رہ جاتے ہیں کہ وہ کسی تقریب میں نہیں جاتے اور ویرانے کو پسند کرتے ہیں۔سنا ہے زندگی صرف ایک تقریب میں انہوں نے شرکت کی تھی اور وہ ان کی شادی کی تقریب تھی۔کراچی کے بارے میں مشفق خواجہ کے کچھ تصورات ہیں۔خالی شہر اچھا لگتا ہے۔اس لئے اکثر ادیبوں پر لاٹھی چارج کرتے ہوئے پائے گئے ہیں۔اہل قلم کانفرنس کے انعقاد میں اور ادیبوں کی کراچی بدری میں ان کا ہاتھ تو ضرور ہوگا کہ اس مخلوق سے چند روز کے لئے تو چھٹکارا حاصل ہو۔یار لوگ اسے ''مشفق مسیح'' سازش کا نام دیتے ہیں۔اگر آپ اسے دو میم (م+میم) سازش کہنا پسند نہ کریں تو کراچی کا ''لندن پلان'' کہہ لیجئے۔لاہور کا حال بھی مختلف نہیں۔مسیح الدین صدیقی بہت دانا آدمی ہیں۔بیک وقت قاسمی گروپ اور وزیر آغا گروپ کو دعوت دیتے ہیں ایک کا جھنڈا عطاء الحق قاسمی نے اور دوسرے کا پرچم انور سدید نے اُٹھا رکھا ہوتا ہے، جو ادیب جس کو پہلے ملے اسے وہ اُچک لیتا ہے اور اچھے کھانے کا چکمہ دیتا ہے اور اس طرح دونوں پورا پنجاب خالی کرا لیتے ہیں۔سبھی ادیب' شاعر' ادیب دوست' شاعر نواز' بڑے ادیبوں کے پی اے' چھوٹے ادیبوں کے جمورے' کتاب' فہم اور اکاؤنٹنٹ تک اسلام آباد کا رخ کرتے ہیں۔

''بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں''

ایک آدھ روٹھے ہوئے ادیب کے سوا سبھی پا بہ رکاب ہیں بلکہ رکاب دار تک کو دعوت

نامے مل چکے ہیں۔مسئلہ صرف اچھی نشست اچھا کھانا اور فوری زادراہ کا ہے۔

ادیبوں کا مسئلہ کڈھب ہے۔کون ادیب ہے کون نہیں۔یہ اھل قلم کی بلا جانے۔مسیح الدین صدیقی نہ ادیب نہ ادیبوں کے آشنا۔جو آسانی سے ہاتھ لک گیا ادیب قرار پایا۔پھر بھی لوگ خفا رہتے ہیں کہ دعوت نامہ نہیں ملا۔شروع شروع میں اھل قلم کانفرنس والوں کو ادیب نہیں ملتے تھے۔انہوں نے کئی اشتہار بھی دیئے لیکن کام نہ بنا۔کہیں نہ کہیں کوئی ادیب بے دعوت رہ جاتا تھا چنانچہ یارلوگوں نے خواجہ غلام فرید کا نام لیا۔صدیقی صاحب نے یقین دلایا کہ اگلے سال انہیں ضرور دعوت نامہ دیا جائے گا۔اگلے سال میر اور غالب تک کو ہوائی سفر کا ٹکٹ بھیجا گیا۔لیکن یہ حضرات بھی تشریف نہ لائے۔کانفرنس کے کارکنوں کو خاصا انتظار رہا۔

رفتہ رفتہ ادیبوں کے رنگ ڈھنگ معلوم ہونے لگے۔تجویز ہوئی کہ اھل قلم کی ایک ڈائریکٹری بنائی جائے اور اس کے مطابق دعوت نامے جایا کریں۔ڈائریکٹری تیار ہوئی تو پتہ چلا کہ ادیبوں کی بجائے غلطی سے رکشہ ڈرائیوروں کی ڈائریکٹری چھپ گئی ہے۔چنانچہ ڈائریکٹری کو کالعدم قرار دیا گیا۔بالکل اسی طرح جیسے ہماری جملہ سیاسی جماعتیں کالعدم ہیں اور ان کے اکثر لیڈر بھی کالعدم لیڈر کہلاتے ہیں۔اس کشمکش میں کچھ ادیب بھی کالعدم ہو گئے۔

کوئی ادبی حادثہ ہو تو مسیح الدین صدیقی لاہور کا رخ ضرور کرتے ہیں۔کوئی ادیب بیمار ہو اس کے لئے کفن دفن کے لئے چیک دیتے ہیں۔کوئی شاعر بیمار ہو تو گلدستہ بھیجتے ہیں۔بیمار ادیب سے تحفہ وصول کرنے میں عار نہیں سمجھتے۔

کوئی ادیب فوت ہو جائے تو اعزہ سے زبانی اظہار تعزیت کے لئے بھی تشریف لاتے ہیں۔ان کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ لاہور مردہ ادیبوں اور کراچی زندہ ادیبوں کا مسکن ہے۔انہیں زندوں سے محبت ہے اس لئے ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں۔آخر کالعدم ادیبوں کی جگہ کالعدم دوستوں کو نوازنا فطری عمل ہے۔اگرچہ لوگ نہیں مانتے اور طرح طرح کی افواہیں

پھیلاتے رہتے ہیں۔

اب یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ لوگ یہ خبر اڑا دیں کہ ایک کالعدم ادارے کو کالعدم کتابوں کے لئے دس ہزار کی سالانہ گرانٹ دی جاتی ہے۔ دوسرے کالعدم محقق کو اس کے کالعدم ادارے اور رسالے کے لئے بیس پچیس ہزار سالانہ کی رقم مخصوص ہے۔ مارکیٹ میں نہ کتاب دکھائی دیتی ہے نہ رسالہ۔ یہی رفتار کار ہے تو سدا رہے نام اللہ کا۔ قوم ایک مسیحا کی تلاش میں ہے۔

◆❖⌘

یہ ہفتہ کیسے گزرے گا

سنیچر ''یہ دن تم پر بھاری ہے۔ستارہ گردش میں ہے۔راولپنڈی کا سفر پیش آئے گا۔صدیق سالک سے ملاقات ہوگی لیکن مقصد حاصل نہ ہوگا''۔

کراچی کی ایک شاعرہ راستہ کاٹے گی۔اس لئے اس دن اکیڈمی آف لیٹرز کے جلسہ میں نہ جانا۔دوستوں سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ دشمنوں سے فی الحال کوئی خطرہ نہیں۔بازو پر امام ضامن باندھ لینا، بلائیں دور رہیں گی۔اتوار کے روز مسیح الدین صدیقی پانچ لاکھ کی رقم دیں گے فوراً قبول کر لینا۔رسید ہرگز نہ دینا ورنہ پچھتاؤ گے''۔

اتوار ''لمبی تان کر سونے کا دن ہے۔گیارہ بجے اٹھنا۔نہار منہ دھوپ میں بیٹھ کر کالم لکھنا۔انشاءاللہ تحریر میں زور پیدا ہوگا۔دوپہر کے بعد تمہارے گھر کچھ ادیب مہمان آئیں گے، انہیں تحسین فراقی کے گھر لے جانا۔بامرّوت آدمی ہے کچھ نہ کچھ ضرور کھلائے گا۔فرنی کھانے میں احتیاط برتنا''۔

پیر ''لاہور میں اپنے ساتھ شام منوا سکو تو اچھا ہے۔اسلام آباد جا کر تپتی دوپہریں منوانے کا کوئی فائدہ نہیں۔محمد منشا یاد ادیبوں کے ساتھ تقریبات منا منا کر ادھ موا ہو گیا ہے اور

اب تو ڈاکٹروں نے اسے مزید تقریبات سے منع کر دیا ہے۔اہل لاہور ابھی تازہ دم ہیں اور بہت کچھ برداشت کر سکتے ہیں۔ان کی سخت جانی کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ فیض احمد فیض اور حفیظ جالندھری' احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا' عطاء الحق قاسمی اور بیدار سرمدی کو بیک وقت برداشت کر رہا ہے۔ایسے دل گردے والے شہر میں ایک شام بھاری نہیں ہوگی اور مضمون لکھوانا کونسا مشکل ہے۔اپنے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ہیں جو ہر موضوع پر رواں ہیں' بس آرڈر اور ناپ دے دیجئے۔ مقالہ مل جائے گا۔زبانی تقریر درکار ہو تو وارث میر بھی بہت چالو ہیں۔انہیں تو موضوع بتانے کی بھی ضرورت نہیں۔تھوڑی سی اداکاری مطلوب ہو تو اشفاق احمد بھی برے نہیں ہیں۔

منگل ''خالد احمد سے ملاقات ہوگی۔وہ قرض مانگے گا رقم نہ دینا ورنہ ڈوب جائے گی۔دو چار لطیفے بے شک سنا دینا،اس کا کالم بن جائے گا اور تمہیں دعا دے گا۔درویشوں کی دعائیں زندگی میں بہت کام آتی ہیں۔خالد احمد کی بددعائیں نہیں لگتیں لیکن دعائیں فوراً لگ جاتی ہیں۔دعا کے لئے ایک شرط ہے کہ اس دن اس نے منہ کی کلی کی ہو اور غسل نہ کر رکھا ہو۔اگر یہ مرد درویش تمہیں شیو کر کے اور نہلا یا ہوا مل جائے تو پہچاننے سے صاف انکار کر دینا کیونکہ اس حالت میں وہ ہرگز خالد احمد نہیں ہوگا''۔

بدھ ''یہ دن تمہارے لئے بہت سازگار ہے۔پاسپورٹ بھی مل سکتا ہے اور غیر ملکی ویزا بھی۔غیر ملکی سفر پر جا سکو تو اچھا ہے۔لیکن کسی ادیب سے مشورہ نہ کرنا۔خاص طور پر مستنصر حسین تارڑ اور عطاء الحق قاسمی سے۔یہ دونوں بڑے کائیاں ہیں۔ایک سفر نامے چھاپ چھاپ کر ڈھیر لگا رہا ہے اور دوسرا ہر بار اپنے سفر نامے کا ٹریلر بھی دکھاتا رہتا ہے۔دونوں بظاہر ایک دوسرے کے دشمن ہیں لیکن اندر سے ملے ہوئے ہیں ایک دوسرے کو مشہور کرنے کے لئے ڈھونگ رچا رہے ہیں۔بھروسہ نہ کرنا''۔

جمعرات ''داتا صاحب کے مزار پر حاضری مفید ہوگی۔تبرک ملے گا،قوال بھی ہاتھ آئیں

گے۔قوالوں کی رنگین تصویریں اخبار میں چھاپ دینا آج کل رنگین صحافت بہت پسند کی جارہی ہے اور قوال برادری ویسے بھی بہت کارآمد ہوگی۔

تمہیں روز روز روحی بانو کی تصویریں چھاپنے کا کوئی فائدہ نہیں۔امجد اسلام امجد کی تصویر چھاپو اسلام کی خدمت ہوگی اور دوستی کا حق بھی ادا ہوگا''۔

جمعہ ''ادب سے زیادہ کاروبار کا دن ہے۔سرکاری افسر سے ملاقات قسمت بدل سکتی ہے۔ڈپٹی کمشنر سے مشاعرے کا دعوت نامہ انکم ٹیکس افسر سے رسالے کے لئے اشتہار اور ایل ڈی اے سے پلاٹ کا حصول ممکن ہے۔تھوڑی سی جرأت اور ذرا سی خوشامد سے کام بن سکتا ہے''۔

◆❖⌘

ناوک نے تیرے.....

(نوٹ):

''آج سے کوئی تیس چالیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ ہمارے ہاں پنجاب میں ویدک دھرم کے پرچارک اور دین متین کے مبلّغ اپنی اپنی قدیم کتابوں میں زمانۂ حال کی ترقیوں اور ایجادات کا سراغ نکالنے کے درپے رہتے تھے اور جب کبھی کسی کو کوئی دور دراز کا ربات بھی ہاتھ لگ جاتی تھی تو وہ اسے نہایت فخر سے عوام کے سامنے پیش کر کے اپنے مدمقابل کا سر نیچا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ظاہر ہے کہ یہ نامعقول مسابقت زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ زمانے کی ایک ہلکی سی کروٹ نے اسے ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔

اب تقریباً ایک چوتھائی صدی کے بعد ہمارے ہاں ترقی پسندی کے ایک نیم سیاسی نیم ادب مذہب نے جنم لیا ہے اور ۱۹۱۰ء کے مناظرین کی طرح اس کے پرجوش مبلغ بھی اس مذہب کو مستند اور باوقار بنانے کے لئے بھارب بھر کم موضوعات پر بحث کے حربے استعمال کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے کی تازہ ترین کڑی یہ ہے کہ ہمارے ایک معزز دوست (احمد ندیم

قاسمی) نے جوسوءِ اتفاق سے ترقی پسند ہو گئے ہیں اپنے نئے مسلک کی چند مخصوص کلیات کو غالب مرحوم ہے منسوب کر کے بیچارے کی روح کو علمی علیین میں بے چین کر دیا۔ ان کی وہ جدت بلکہ جسارت شاید ترقی پسند حلقوں ہی میں محدود رہتی لیکن حسن اتفاق سے ہمارے ایک محبّ گرامی نے اس کا ایک نہایت لطیف چربہ اتارا ہے' چربہ کیا اتارا ہے تحریک کے حامیوں اوران کی تخلیقات کو آئینہ دکھایا ہے اوراز بسکہ آئینہ بردار نیک نیت ہے اس لئے امید ہے کہ وہ اس میں اپنا عکس جمال دیکھ کر چین بہ جبیں نہ ہوں گے۔ (ایڈیٹر)

اِنشاء کے حضور میں (ایک لطیف آمیز پیروڈی):

ہرادب پروپیگنڈہ ہوتا ہے، اپنے خیالات کا عقائد کا اور حالات کا۔ اچھا ادیب ادب میں زندگی کو پیش کرتا ہے۔ کیونکہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب خلا میں سانس نہیں لیتا کیونکہ زندگی بھی خلا میں سانس نہیں لیتی۔ ادب برائے ادب کے نام لیوا خود اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ وہ زندگی کی ہنستی کھیلتی حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ زندگی ایک سیّال حقیقت ہے۔ ہر دم رواں ہر دم جواں۔ اس سیل بہکران کے تھپیڑے کھاتے ہوئے آگے بڑھنا اور بڑھتے چلے جانا ترقی پسند ادیبوں کا شیوہ ہے، وہ ادیب جو ترقی پسند نہیں ہے کبھی زندہ نہیں رہتا۔ اس لئے وہ ہر وقت اپنے آپ کو یقین دلاتا رہتا ہے کہ تم ایک ترقی پسند شاعر ہو کیونکہ تم زندہ ہو۔ کیا ڈیڑھ سو برس میں اتنی قوت ہے کہ اپنے ماحول کی مردنی اور اپنے سماج کی افراتفری اور اپنے تمدن میں اجارہ داری کے خلاف تمہارے باغیانہ احساس کی اہمیت اور اس کے گہرے تاریخی اثرات کو دھندلا کر سکے۔ ترقی پسند گڑے مردے نہیں اکھاڑتے، وہ جنہوں نے

ایک بار بھی شرف انسانی کے چراغ کو اپنے ہاتھ کی اوٹ دی تھی اور جنہوں نے سیاسی اور معاشی استبداد کے خلاف کسی بھی زمانے میں نعرہ بلند کیا تھا، ہر نہیں سکتے۔تم زندہ ہو تو ہمیشہ زندہ رہو گے کیونکہ تم نے جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت کی۔تم نے زندگی کے نغمے گائے تم نے عوامی کلچر کا ساتھ دیا،تم نے عوامی ادب کی تخلیق کی،تم نے جاگیرداری کا مذاق اڑایا۔تم نے اپنے جاگیردار دوستوں کا مذاق اڑایا۔تم نے صحافی کا مذاق اڑایا کیونکہ وہ شاہ کا مصاحب بننا چاہتا تھا،تم آج بھی زندہ ہو،تم ہمیشہ زندہ رہو گے،عوام کبھی نہیں مرتے،عوام کا ادب کبھی نہیں مرتا۔تم کبھی نہیں مر سکتے کیونکہ تم کبھی نہیں مرے۔تم اس زمانے میں پیدا ہوئے جب جاگیردارانہ نظام آخری سانس لے رہا تھا مغلیہ شان وشوکت جس نے عوام کی ہڈیوں سے تاج محل اور خون سے لال قلعے تعمیر کئے،جس نے مذہب کے نام پر عوام کو افیون کا عادی بنایا،کیا یہ دم توڑ رہی تھی؟نہیں، بلکہ دلّی دربار کے پٹے ہوئے مہرے ہندوستان کے چپے چپے میں زندگی کی ازلی اقدار کے خلاف نبرد آزما ہیں۔

انگریز سامراج کا چکور سایہ ہمارے تکونے دیس پر چھا رہا تھا اس وقت اس امر کی اشد ضرورت تھی کہ سارے فنکار اپنے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے نچلے طبقے کے ذہنوں کا ساتھ دیتے۔تم نے جرأت اور بہادری سے کام لیتے ہوئے عوام کا سیاسی شعور بیدار کیا اور جاگیرداروں کو للکارا ہے۔

کہیں اے صید جلدی بھاگ اپنی خیر چاہے تو
یہ دیکھ آئے ہیں فوج اشک کے پیہم دوہڑے جیسا

سید انشا تم نے اس شعر میں انگریزوں کے صنعتی پروگرام کی طرف بھی نہایت لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے اور اپنے دیس کے عوام کو خبردار کیا ہے کہ برق وآہن کا یہ کھیل جو مشینوں اور کارخانوں کی صورت میں تم پر مسلط کیا جا رہا ہے اس سے دور بھاگو۔اگر اس کے پنجے میں گرفتار ہو گئے تو ساری عمر آٹھ آٹھ آنسو روتے رہو گے۔اور اس غزل کے مطلع میں بھی تو تم نے جاگیردار

طبقے کو طنزیہ انداز میں مخاطب کیا ہے کہ

رہا ہے ہوش کچھ باقی اسے اب بھی نہیڑے جا　　یہی آہنگ ہے مطوب پر کچھ اور چھیڑے جا
مجھے اس درد میں لذت ہے اے جوش جنون اچھا　　مرے زخم جگر کے ہر گھڑی ٹانکے ادھیڑے جا

قافیہ ''ادھیڑے'' کھلا اشارہ ہے بورد اطبقے کی طرف جو پر دلتاریوں پر ظالم ڈھاتا رہا اور تمہاری آواز چیخوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی لیکن تمہارے سینے میں شمع امید جھلملاتی رہی۔

بڑے ہیں آشنا اپنے جو گرداب محبت میں　　کنارے کب لگیں گے دیکھیئے ان سب کے پہڑے جا

معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا یہ انقلابی نعرہ ہے، اثر ثابت نہیں ہوا اور جاگیرداروں کو ان کا احساس ہو گیا کہ عوام اب آہستہ آہستہ بیدار ہو رہے ہیں۔

سوال بوسہ سن کہنے لگا وہ شوخ غصّہ جُو　　بہت اچھا سمجھ لوں گا بھلا تو مجھ کو چھیڑے جا

اب رجواڑوں نوابوں اور جاگیرداروں نے اپنے اپنے گرتے ہوئے ستونوں کو سنبھالا دینے کے لئے فرنگی کا سہارا ڈھونڈا، جو اپنے تجارتی مفاد کے لئے اخّوت مساوات اور حرّیت کے بلند بانگ دعوؤں کے جال بکھیر کر ایشیا کو غلامی کے گھناؤنے بندھنوں میں جکڑ رہے تھے۔لیکن یہ آندھی مزدور کی جھونپڑی میں ٹمٹماتے ہوئے دیئے کو کبھی نہیں بجھا سکتی۔

آزادی کے نعرے بلند کرتے کرتے تم پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی لیکن اس وارفتگی کے عالم میں بھی تم صرف نغمۂ آزادی کے طلبگار رہے وہ نغمۂ جس نے فرانس کے پسے ہوئے عوام کو ابھارا۔جس نے امریکہ کو حق خود اختیاری بخشا، جس نے چھ سال ہی میں یورپ کے شاہی ایوانوں میں لرزہ پیدا کر دیا۔اور جو ۱۹۰۴ میں ایک حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آ گیا۔شراب پرتگالی کو اس عظیم جدوجہد کے سمبل کے طور پر استعمال کرنا تمہارا ہی کام ہے۔

تم اس لئے اور بھی زیادہ قابل قدر ہو کہ تم ایک رئیس کے بیٹے تھے جس کے دروازے پر رات دن ہاتھی جھوما کرتے تھے۔تمہیں اونچے طبقے میں ملنے جلنے کے بہترین مواقع حاصل

تھے۔اورتم چاہتے تو خوداس فرسودہ نظام کے جزو بن کے رہ جاتے۔لیکن تمہاری ضربیں مستقبل کے پولے چیر رہی،تمہیں تم نے اپنے جاگیردار ساتھیوں کوآئینۂ فردامیں بڑھتے ہوئے طوفان دکھا کرانہیں اپنی حالت سنوارنے کو کہا۔انہیں سمجھایا کہ اگر خونی انقلاب سے بچنا چاہتے ہوتو اپنے مزارعوں اوررعایا کے دکھ درد کامداوا کرو۔

شفقت سے ہاتھ تو دھرٹک دل پہ میرے تا ہو　　یہ آگ سا دھکتا سینے کا داغ ٹھنڈا

لیکن وہ اپنی محفل رنگ میں نشۂ امارت میں چُور پائے ساقی پر سر رکھے پڑے رہے۔انہیں عوام کے سینے میں دھکتے ہوئے داغوں کی پرواہ نہ تھی۔وہ صرف اپنی ہوس کی آگ بجھانا چاہتے تھے۔وہ غریبوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تو درکنار گفتگو کرنا بھی عار سمجھتے تھے۔

جھڑک کے کہنے لگے، چلے بہت اب تم　　کبھی جو بھول کے ان سے کلام کیا میں نے

چنانچہ تم نے یہ محسوس کرلیا کہ یہ طبقہ ہلکی پھلکی تابوں سے نہیں سنبھل سکتا اس کے لئے تیشۂ فرہاد کی ضرورت ہے اس لئے تم نے یہ کہہ دیا کہ۔ع

جھوٹا　　نکلا　　قرار　　تیرا

اب　کس　کو　ہے　اعتبار　تیرا

دارالسلطنت دھلی اندھے شاہ عالم ثانی کے زیر سایہ طبقاتی نظام کا بدترین نمونہ پیش کر رہی تھی۔امرا''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کی چلتی پھرتی تصویریں اپنی رنگ رلیوں میں چور ومزدور کے پسینے سے بے پرواہ،عطرِ حنا میں بسے ہوئے مصر کے فرعونوں کی یاد تازہ کر رہے تھے۔تمہارے اس رویئے نے امراء کی صف میں ایک ہیجان برپا کر دیا کہ ان کے ٹکڑے کھانے والے اپنے آقاؤں کی عدالت میں بلبلا کر اٹھ بیٹھے۔بادشاہوں اور جاگیرداروں کے گن گانے مشہور شاعر سوداؔ کے شاگرد رشید عظیم کے ساتھ تمہارے معرکے اس کی بھی شہادت پیش کرتے ہیں۔عظیم، محبّ اور بے کس، اسی قبیل کے دوسرے شاعر جوان دنوں دلّی سکول پر چھائے ہوئے

تھے۔تم پر کیچڑ اُچھالنے لگے۔ع

ظاہر میں تو ایسے ہیں ماشاء اللہ　　سب کہتے ہوں اک ہوں گے انشاء اللہ
باطن میں جو دیکھا انہیں اتنے ہیں پوچ　　لا حول ولا قوّت الا باللہ

لیکن ایک ترقی پسند شاعر کے لئے مخالفت ہمیشہ ایک کسوٹی ثابت ہوتی ہے اور ہم یہ دیکھ کر آج بھی خوشی اور فخر سے سر بلند کر لیتے ہیں کہ تم سینہ تان کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور تم نے ہندوستان میں پہلی بار اس حقیقت کا اعلان کیا کہ مزدور کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے قیصر و کسریٰ کے تاج سرنگوں ہیں۔

اک طفلِ دبستاں ہے فلاطوں میرے آگے　　کیا منہ ہے ارسطو کا کرے چوں مرے آگے
کیا حال بھلا قصرِ فریدوں مرے آگے　　ماپنے ہے پڑا گنبد گردوں مرے آگے

دلی کے عوام کو درس حریت دینے کے بہت تم فیض آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ جا پہنچے۔ جہاں کے بے کس باشندے نواب سعادت علی خان کی اجارہ داری کے دو پاٹوں میں پسے جا رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر تو ہمیں طبقاتی تقسیم کا اور بھی شدّت سے احساس ہوا اور اس دیوار کو جو اونچے اور نیچے طبقے کے درمیان یاجوج ماجوج کی پیہم کوششوں کے باوجود کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہی ہے قابل عمود بنانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ع

دربار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا　　جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا
ہمسایہ آپ کے میں لیتا ہوں اک حویلی　　اس شہر میں ہوا گر چندے قیام میرا
جو کچھ کہ عرض کی ہے سو کر دکھاؤں گا میں　　راضی نہ آپ سمجھیں یوں ہی کلام میرا
اچھا مجھے ستاؤ جتنا وہ چاہوں میں بھی　　سمجھوں گا گر ہے انشاء اللہ نام میرا
پوچھا کسی نے مجھ کو ان سے کہ کون ہے وہ　　بولے وہ ہنس کے یہ بھی ہے اک غلام میرا

آخری مصرعہ کی ضرورت اس فرسودہ نظام کے سینے میں خنجر سے کم نہیں۔

سعادت علی خان نے جب دیکھا کہ یہ نو وارد اپنے آتشیں کلام سا بغاوت کو ہوا دے رہا ہے اور افیون کے نشے میں اونگھتے ہوئے لکھنوی عوام کو جھنجھوڑ کر جگا رہا ہے تو اس نے اس آگ کو سرد کرنے کیلئے اسے اپنی مساحبت میں لے لیا۔لیکن روپیہ بھی تمہیں نہ خرید سکا۔کیونکہ تمہارا عزم اور راسخ اور تمہارے عقائد پختہ تھے۔تمہارے پیشرو فرانس کے عوامی ادیب والمیم کی مثال تمہارے سامنے تھی جسے فریڈرک آف پرشیا بھی وہ خرید سکا۔تمہارے بین الاقوامی تاریخی شعر نے تمہاری رہنمائی کی اور تم اس نام مزدور سے صاف بچ گئے۔اس زمانے میں تم نے گیان چھ ساھوکار کے خلاف اپنی معرکہ آراء نظم لکھی جس میں امیروں کی ہیں کارہوں کا کہا چھٹا کھولا ہے۔ اور ساھوکار کا حلیہ اس طرح پیش کیا ہے۔

واہ بے پھولے پھال گال اور وہ وہ انکے منہ کی رال
توند میں یہ ہوا بھوی دھونک نی کی جو جیسے کمال

انتظامی شاعر کے لئے مشعل راہنما اور اس نے مہاجن جیسی نظم کی تخلیق کی۔

مہاجن دشمنی سے کہیں زیادہ انگریز دشمنی تم میں سرایت کر چکی تھی۔چنانچہ تم ہمیشہ ایسے ہندوستانیوں کو ملامت کرتے رہے جو انگریزوں کے ہاں ملازمت کرتے تھے۔علی قلی خان میر منشی جان پیلی صاحب ریذیڈنٹ کے ہاں طارم تھے۔ہمیں تمہارا وہ فقرہ اب تک یاد ہے جو تم میر منڈی صاحب کی شان میں کہا کرتے تھے۔کہ میر منشی صاحب کا اللم یاسی۔

وہابی تحریک اور ہمارے علماء کرام کا انگریزی تعلم اور سواری ملازمت کے خناف پہیم جہاد تمہارے انہیں خیالات کا پرتو مطوم ہوتا ہے۔

سعادت علی خان کے درباری او مصائب ہونے کے باوجود سر محفل اس کے تھپڑ مارنے پر اسے شیطان کہہ دینا تمہارا ہی کام تھا۔اور نجیب الطریفین کی بحث چھیڑے پر اسے صاف صاف لونڈی زادہ کہہ دینا عوام کی اخلاقی قدروں کی حمایت میں پہلا قدم تھا۔

تم نے سماج کے سینے کے ریستے ہوئے ناسور طوائف کا ہنر مطالعہ کیا اور اس کے حل تلاش کئے تم نے پہلی باران کی زبان کو ادب میں ایک مستقل جگہ دی۔ رنگین کی مانند تم نے لذت کشی سے کام نہیں لیا بلکہ انہیں سماج کا اہم حصہ ہونے کا احساس دلایا اپنے ہم وطنوں کو بتایا کہ اسے رادہ درگاہ طبقہ دان سمجھنا چاہئے بلکہ یہ لوگ ہماری ہمدردی اور تعاون کے مستحق ہیں۔

اپنا جو جتانا ہو ہیں زند نگوڑا صدقے لے کر ڈالیئے درگزر نگوڑا

سید انشاء انسانیت کی ان ٹھکرائی ہوئی ماؤں بہنوں پر جو تم نے احساس کیا ہے وہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہیں کر سکتیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے ان کے احساسات و جذبات کا ایسی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے کہ تم خود ان میں رچے بسے مطوم ہوتے ہو۔

نہیں یان کسی آشنا کی توقع ہمیں ہے بس اپنے خدا کی توقع
پڑی ہے جو مشکل تو کیا ڈر ہے انشاء کہ رکھتی ہوں مشکل کشا کی توقع

افسوس ہے کہ اس فطن میں تمہارے بعد قاضی عبدالغفار کے سوا اور کسی ادیب نے کوئی قابل قدر اور قابل ذکر خدمت افہام نہیں دی۔

اردو ادب پر تم نے ایک اور احسان بھی کیا۔ سبل خاص تمہاری ایجاد ہے۔ مزدور کے لئے فرھاد۔ انقلاب کے لئے۔ صراحی غربت کے لئے عریانی' غریبوں کے لئے زندر مذہبی رہنماؤں اور پیرون کے لئے مہت۔ امیر کے لئے خواجہ وغیرہ الفاظ تراشے۔

گرا جو فرھاد کے کہیں تیشہ درون گرہ سے نکلی صدائے واویلا
کوئی دنیا سے کیا بھلا مانگے وہ تو ہے چاری آپ ننگی ہے
حوصلہ ہے فراخ رندون کا خرچ کی پر بہت ہی تنگی ہے
یہ جو مہنت بیٹھے ہیں وادھا کے کند پر اوتار بن کر گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر
دنیا کی ایدھر کی گرادوھر ہو جائے بڈھے خواجہ کی کس طرح خو ہو جائے

تیرے شہید کے بالین پہ صبح تک شب دفن اگر کی بتی جدا جلتی ہے سب جدا

کہنے والے کہیں گے کہ تم نے یہ سب کچھ کیا۔ مگر بادشاہوں کے قصیدے بھی تو لکھے اور میں اس معاشرت پر لعنت بھیجوں گا جس نے تمہیں.....شاہ عالم، سلیمان شکوہ، سعادت علی اور جارج سوم.....کی مدح سرائی پر مبور کر دیا۔ یہ قصیدے ان چنگاریوں کو سرد ذہن کر سکتے جو آج بھی تمہارا کلام پڑھ کر ہمارے سینے میں جگمگا اٹھی ہیں۔ بلکہ ہمارے دلوں کو ایک بہتر نظام کی توقع آج بھی گرما رہی ہے اور ہم تمہارے ہم آواز ہو کر یہ کہہ سکتے ہیں۔ ع

غیب جا گیں گے بیگنا ہی تو میں بھی اک رگ جگا کروں گی

ابھی تو انشاء کے ساتھ مجھ کو پڑے ہیں پاپڑ بیلنے کو

اس نظام کو حاصل کرنے کے لئے جس میں طبقاتی نزاع کا مکمل فائدہ ہوگا نہ جانے ہمیں کتنے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔

(ادبی دنیا۔ جولائی ۱۹۴۹ع)

◆❖⌘

(۴)

تحریفات

قصہ آسیب زدہ مکان کا

نانی امّاں کہتی تھیں ایک دفعہ اقبال ٹاؤن میں چڑیلیں، بھوتوں اور جنات نے ڈیرا جما لیا ایک شاعرہ کے مکان میں آدھی رات کے وقت دروازے اور کھڑکیاں خود بخود کھلنے بند ہونے لگے۔ بھوت اور بھتنیوں نے کھلی کچہری لگائی، جس میں بڑے بڑے ادیبوں کی پیشی ہوئی۔ وہ اپنا اپنا اعمال نامہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے جس سے ان کی آنکھیں منجمد ہو گئیں اور وہ پتھروں میں تبدیل ہو گئے۔ باہر خاردار تار کے پاس عریاں بدن، لمبے بالوں والی خوبصورت چڑیلیں سیاپا کرتی آئیں ان کے ناخن لمبے اور پاؤں پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ ہر چڑیل کا قد کبھی تو بڑا ہو کر عبداللہ حسین کے برابر ہو جاتا تھا اور کبھی سکڑ کر پدے کے برابر رہ جاتا تھا۔ چڑیلیں گھر کے اندر داخل ہو گئیں اور بھتنیوں کو سوئی گیس پر روسٹ کر کے کھا گئیں۔ اسی لمحے جن دیوار کے پار ناچتے رہے۔ پاپ موسیقی کی تال پر انہوں نے منیر نیازی کی غزلیں گائیں۔ پھر یک لخت موسیقی تھم گئی۔ سب نے اپنے اپنے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ ان کے سر کے بال جھڑ گئے اور اندر سے شکلیں انتظار حسین جیسی نکل آئیں۔ پھر چڑیلیں واپس گھروں کو لوٹ گئیں اور ہر طرف گیدڑوں کی آوازیں پھیل گئیں اور پھیلتی چلی گئیں اور پیپل کی شاخیں ہاتھ اوپر اٹھا اٹھا کر آسمان کی طرف لپکنے

لگیں۔ نانی اماں نے دوھتیوں اور پوتیوں کو کھیاں بنا کر اپنے گریبان میں چھپا لیا۔ دروازے کی کنڈی ہلنے لگی۔ یاجوج نے ماجوج کے منہ پر تھپڑ امارا۔ ہابیل نے قابیل کو رسی گلے میں کھلائے اور ذہین نوجوان نے سوچا اب تو صدیاں بیت گئیں میں تو بالکل ہی غبی ہو گیا ہوں آنکھوں میں سرمہ بھی نہیں جھونک سکا' نہ پان چبا سکتا ہوں۔ نانی اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں قیامت کی گھڑی اس وقت آئے گی جب آدمی آدمی نہ رہیں گے' نہ کوئی آنکھوں میں سرمہ لگائے گا، نہ کوئی پان کی پیک دیوار پر مارے گا۔ تو اپرات سے' پرات آٹے سے' آٹا مالک سے' مالک کتے سے اور کتا ادیب سے اپنا حق مانگے گا لیکن دنیا کے کان بند ہو جائیں گے۔ کوئی کسی کی نہ سنے گا اور ہر شخص اپنی کہے جائے گا۔ سورج سوا نیزے پر آ کر سلامی دے گا اور زلزلے تو پیں داغیں گے اور خلق خدا سجدے میں گر کر امان مانگے گی اور پھر میرٹھ سے سری پائے آئیں گے۔ بیبیاں چہلم پر بیٹھ کر کھائیں گی اور ایک دوسری کی چغلیاں کریں گی اور اگلے وقتوں کو یاد کریں گی۔ جب چمنیوں سے دھواں نکلتا تھا' گھروں میں میلاد کی محفلیں کی تھیں اور چھڑی سے کبوتر کٹی ہوئی پتنگ کی طرح زمین پر اترتے تھے اور اترتے ہی چلے جاتے تھے۔ سوچتا ہوں آج بستی والوں کا کریا کرم ہو ہی جائے اور سارے ادیب اپنے منڈے ہوئے سروں اور توتلی زبانوں کے ساتھ اس میں شریک ہوں اور میں کنارے پر بیٹھا پونگی بجاتا رہوں اور چاندی کی پیالی میں آہستہ آہستہ افیم گھولتا چلا جاؤں۔

صبح ہونے والی ہے اور یہ حرام خور نیند آ ہی نہیں چکتی۔ صبح ٹی ہاؤس کے بہرے سے مل کر گہری نیند سونے کا نسخہ معلوم کروں گا۔ خدا جانے احمد مشتاق اور مظفر علی سیدہ بغیر نسخے کے کس طرح سو جاتے ہیں اور پھر روز ہی سو جاتے ہیں۔ نہ انہیں طوطے کی طرح بجلی کے تار پر الٹا لٹکنا آتا ہے نہ کبوتر کی طرح گھٹک سکتے ہیں۔ پھر بھی سمجھتے ہیں ہم بڑے لکھاری ہیں۔ بڑے آئے لکھاری کہیں کے۔

◆❖⌘

بچوں کے لئے نادر تحفہ

عید کی خوشیوں کے موقع پر اپنی معنوی اولاد کو دیدہ زیب اور پائے دار محاورے پہنائیے جو دلفریب پیکنگ میں ہماری دکان سے دستیاب ہیں۔ ہمارے شوروم واقع دفتر روزنامہ ''مشرق'' لاہور میں تشریف لائیں۔ سکہ بند محاورہ بازوں کے لئے خاص رعایت یہ ہے کہ قیمت بعد از فروخت ادا فرمائیں۔ اس کے لئے کسی بینک گارنٹی کی بھی ضرورت نہیں۔ انتظار حسین صاحب سے براہ راست خریدنے والوں کو تازہ محاوروں پر پچاس فیصد اور باسی محاوروں پر بیس فیصد کمیشن دیا جاتا ہے۔ برف میں لگے ہوئے سو سال پرانے محاورے ارزاں نرخوں پر آثار قدیمہ کے شائقین کو مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ استعمال شدہ محاوروں کی مرّمت کا کام بھی حسب منشا سستے داموں ہماری ورکشاپ میں کیا جاتا ہے۔ شوقین اہل قلم کے لئے نادر محاورے پولیتھین کی تھیلیوں میں بند کر کے ڈاک کے ذریعے بھی روانہ کرنے کا انتظام ہے۔ تھوک مال کی سپلائی کے لئے پاکستان نیشنل سنٹر الفلاح بلڈنگ شاہراہ قائداعظم لاہور سے رجوع فرمائیں۔ پرچون کے لئے انتظار حسین میرٹھی تاجر چرم محاورات نانی اماں کی کٹیا چوھٹہ مفتی باقر اندرون شہر سے حاصل کریں۔ طغلانہ محاوروں کے لئے حال ہی میں نیا بندوبست کیا گیا ہے۔ ماں کے دودھ کے بعد

سب سے زیادہ غذائیت سے بھرپور محاورے آپ کی درازی نسل کے ضامن ہیں۔ہم نے اپنے کرم فرماؤں کی خاص سہولت کے لئے اسلام آباد میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے دفتر سے بچگانہ محاوروں کو ٹین کے ڈبوں میں بارعایت سپلائی کا اہتمام کیا ہے جہاں ہمارا خاص نمائندہ آپ کی ہر ضرورت کو پورا کرے گا۔حفظان صحت کے اصولوں کے عین مطابق نسوانی ہاتھوں سے پیک کئے ہوئے ڈبے آپ کی خوش ذوقی کی ضمانت ہیں۔

◆❖⌘

ادب کا میلہ مویشیاں

حال ہی میں لاہور میں میلہ مویشیاں ہوا۔ بڑی رونق رہی۔ پہلے میلہ قسم کی تقریبات ہوتی تھیں تو ایک آدھ مشاعرہ ضرور ہوتا تھا۔ لاہور کی صنعتی نمائشوں کا نمایاں پہلو مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ شاعری اس وقت صنعت شعار ہوتی تھی۔ اب کلچر کا بہت واویلا ہے۔ کلچر کا رشتہ ایگری کلچر سے بھی ہے اس لئے شاعری کو بھی صحت کی بجائے کلچر یا ایگری کلچر کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مناسبت سے ضرورت تھی کہ میلہ مویشیاں کے موقع پر ایک زرعی یا ثقافتی مشاعرہ بھی ہو جاتا لیکن لاہور پہلا سا لاہور نہیں رہا۔ ادیبوں کا میلہ مویشیاں بھی اسلام آباد میں ہوتا ہے۔ لاہور کے ادیب ''کوٹہ سسٹم'' کے تحت منتخب کر کے اسلام آباد روانہ کئے جاتے ہیں اور باقی اخبارات میں بیان دے کر اپنا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔

میلہ مویشیاں کی خاص چیز سدھائے ہوئے جانور اونٹ' گھوڑے اور بیل کا رقص ہے۔ رقص معلوم نہیں ہمارے کلچر کا حصہ تھا یا نہیں بہر حال عوامی کلچر کا حصہ ضرور معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے طبلے کی تھاپ پر ادیبوں کو بھنگڑا ڈالتے ہوئے خود بھی دیکھا ہے اور بعض کی تصویریں بھی اخباروں کے صفحات کی زینت بن چکی ہیں۔ اس لحاظ سے سدھائے ہوئے گھوڑوں اور اونٹوں

کے رقص کو ہم ادب کی حد تک جائز قرار دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں اور عنقریب اس بارے میں ایک بیان بھی شائع کریں گے۔ رقص مشکل ہے ہر ادیب یا شاعر کے بس کا بھی نہیں کیونکہ تال پر رقص بڑے ریاض کے بعد ہی ممکن ہے۔ گھوڑے اور اونٹ کا رقص اس سیاسی تربیت کا نتیجہ ہے جو مالکوں نے انہیں دی۔

ادیب اور شاعر تیس چالیس برس سے یہی تربیت حاصل کر رہے ہیں چند ایک بڑے کامیاب رقّاص نکلے جو ہر حکومت کی تال پر رقص کرنا جانتے ہیں۔ بعض مغربی دھنوں پر زیادہ کامیابی سے ناچتے ہیں، بعض علاقائی دھنوں پر زیادہ مہارت سے رقص کرتے ہیں۔ طبلے کی تھاپ بہر حال بنیادی چیز ہے اور ہمارے ادیب اور شاعر اس تھاپ کو خوب سمجھتے ہیں اور یہ نتیجہ ہے سیاسی بصیرت اور سماجی تربیت کا۔ جمہوریت کے لئے تربیت میسر ہو نہ ہو، رقص کے لئے تربیت آسانی سے مل سکتی ہے اور اس کے لئے جگہ جگہ تربیت گاہیں قائم ہیں۔ سیاسی پنڈالوں سے لے کر جلسوں جلوسوں سے ہوتا ہوا یہ راستہ درسگاہوں تک بھی جاتا ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں ہڑتالوں کا چرچا رہتا ہے۔ ہڑتال بھی رقص ہی کی ایک آزاد شکل ہے۔ جس میں تھاپ اور سر کا کچھ زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا۔ صرف آہنگ کافی ہوتا ہے۔ اسی بناء پر ماہرین نے رقص کی ایک سے زیادہ قسمیں قرار دی ہیں۔ بابندر قص، رقص مصری، رقص آزاد اور رقص بسمل، یہ سارے رقص ہماری ایجاد خاص ہیں اور ہم نے مغربی دھنوں میں اپنے کلچر کو بھی شامل کر لیا ہے جس سے یہ رقص ہماری خاص ثقافتی پہچان بن گئے ہیں۔

گھوڑے، اونٹ اور بیل سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ رقص کے علاوہ ان کے انفرادی رجحانات بھی ہماری ادبی زندگی کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ اشفاق احمد تو اپنی ''گھوڑا حس'' کے لئے بہت مشہور ہیں۔ ان کے افسانوں میں اکثر گھوڑوں کا ذکر ملتا ہے۔ اس لئے وہ رقص اور موسیقی کے دل دادہ ہیں کہ انہوں نے اپنے کلچر کو گھوڑے کے حوالے سے پہچانا ہے۔ اب تو ہمارے اکثر ثقافتی شو اشفاق احمد کے بغیر مکمل نہیں ہوتے کیونکہ ان کا گھوڑا ہر دور میں سب سے

آ گے رہتا ہے کہ وہ اچھے سوار ہیں اور گھوڑے کی نبض کو پہچانتے ہیں۔

ادب میں یہ مسئلہ اہم رہا ہے کہ کون کس کا گھوڑا ہے؟ بڑے گھوڑے چھوٹے گھوڑوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔سواری کے لئے گھوڑا بیل سے بہتر ہے۔بیل تو بعض اوقات آ بیل مجھے مار پر بھی عمل کرتا ہے۔جن ادیبوں نے بیل پالے تھے وہ اب سخت مشکل میں ہیں کیونکہ ان کے پالے ہوئے بیل اب انہیں بار بار اپنے سینگوں پر اٹھا اٹھا کر پھینکنے پر مصر ہیں لیکن ''گھوڑے پال ادیب'' مزے میں ہیں اگر چہ ان کے گھوڑے بھی کبھی کبھی بدکتے ہیں لیکن فوراً ہی اپنی کنوٹیاں نیچے کر لیتے ہیں پس ذرا سا تو بڑا منہ پر اور تو بڑے میں تھوڑے سے دانے۔گھوڑے کا کیا ہے چارہ مل گیا تو خاموش نہ ملا تو دو گھڑی ہنہنانے لگے گا اور بس۔گھوڑا بہر حال بیل سے زیادہ وفادار جانور ہے اس لئے وہ شاعر اور ادیب مزے میں ہیں جنہوں نے بیل نہیں پالے اور گھورے پالے ہیں۔گھوڑا سواری کے کام بھی آ تا ہے اور بار برداری کے بھی۔نمائش لگے تو کرتب بھی دکھاتا ہے لیکن ہمیشہ طبلے کی تھاپ کا خیال رکھتا ہے اور یہی وصف اس کی کامیابی اور سوار کی کامیابی کا ضامن ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ گھوڑے پالنا ہر ادیب کے لئے کتنا ضروری ہے اور یہ ادب کے میلہ مویشیاں میں کامیابی کا سب سے بڑا وسیلہ بھی ہے۔آپ خود آسانی سے گھوڑے بیچ کر سو سکتے ہیں۔گھوڑا آپ کے مفادات کی خود ہی حفاظت کرے گا۔

◆❖⌘

ادبی نیلام گھر

دیکھتی آنکھو! سنتے کانو! آپ کو نظم معرّیٰ، نثری نظم اور طارق عزیز کا سلام پہنچے۔ آنے والے معزز مہمانوں کو خوش آمدید۔ ہفتہ وار نیلام گھر کا آج آخری پروگرام ہے۔

آپ گزشتہ ایک صدی سے ہمارا پروگرام دیکھ رہے ہیں اور برداشت کر رہے ہیں۔ آپ کی قوّت برداشت کے ہم خاص طور پر ممنون ہیں۔ اس پروگرام کے ساتھ ہم آپ سے رخصت چاہیں گے لیکن خواتین وحضرات! یہ نہ سمجھئے کہ ہم خدانخواستہ دنیا سے یا ٹی وی سے کوچ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، ہم اب آپ کی خدمت میں کسی اور پروگرام میں حاضر ہوں گے اور انشاءاللہ بشرط زندگی حاضر ہوتے رہیں گے۔

ہم نے سوچا اس آخری پروگرام میں باقی ''مال اسباب'' بھی ٹھکانے لگا دیا جائے ' گودام کھولا تو اس میں کچھ ادبی مال بھی بوریوں میں بند تھا۔ خیال آیا کہ اس سے پہلے ہم ایک دو پروگرام بچوں کے لئے' ایک آدھ عمر رسیدہ خواتین کے لئے' شروع شروع کے چند ایک پروگرام صرف بالغ مردوں اور نابالغ عورتوں کے لئے پیش کر چکے ہیں۔ تو کیوں نہ چلتے چلتے ادب کا ایک نیلام گھر بھی پیش کر دیں۔

ہم نے اس بار ادیبوں، شاعروں کو دعوت دی ہے کہ وہ تشریف لا کر ناظرین کو اپنے کارناموں سے روشناس کرائیں۔ آخر کارخانۂ قدرت میں کون سی چیز بیکار ہے۔ ردّی کاغذ سے گتہ بن سکتا ہے، کوڑے کرکٹ سے کھاد تیار ہو سکتی ہے تو ادب کسی کام کیوں نہیں آ سکتا۔ آپ کے بچے مشاعرے سن کر خوش ہوتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں، لڑکے بالے شاعروں کو ہوٹ کرتے اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ امیر زادے اپنے ڈرائنگ روموں میں شعری مجالس منعقد کر کے دل بہلاتے ہیں۔ اخبارات ادبی ایڈیشن چھاپ کر ادب کی سرپرستی کرتے ہیں اور درمیان میں اداکار خواتین کی تصویریں بھی شائع کر کے اپنی مانگ بڑھاتے ہیں۔ غرض کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ادیب اور شاعر بھی بے کار پیدا نہیں کیا یہ دوسری بات ہے کہ ہمیں بعض ادیب فالتو نظر آ رہے ہیں۔

یہ پروگرام ایک اور وجہ سے بھی ہمارے لئے ناگزیر ہو گیا تھا کہ یہ مزدوروں کا عالمی سال ''بے پروگرام'' جا رہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ اس موقع پر ادیبوں کا نیلام گھر سجائیں تا کہ ہم بھی اس سعادت میں شریک ہو جائیں۔ ادیبوں کی امداد کے لئے ایک ادبی ادارے نے بھی حال ہی میں بڑا کام کیا ہے۔ اسلام آباد میں اہل قلم کانفرنس منعقد کی اور ملک کے گوشے گوشے سے انواع و اقسام کے ادیب شاعر، مفتی، اداکار اور خرکار جمع کئے چنانچہ کانفرنس کی دھومیں آج تک ہیں۔ ہر اخبار میں کالم لکھے جا رہے ہیں، سفرنامے شائع ہو رہے ہیں۔ ''نثری'' اور ''نظمی'' قصیدے تحریر کئے جا رہے ہیں۔ خیال آیا کہ ممکن ہے بعض ادیب خوش ہو کر ہماری شان میں بھی ''دو بول'' کہہ دیں یا ٹی وی والوں کو کوئی قرارداد یا تعریفی خط بھی لکھ دیں کہ وہ ہمیں تاحیات اپنے پروگرام جاری رکھنے کی اجازت دے دیں۔

ادیب تو بڑے نیک دل اور سادہ لوح ہوتے ہیں، جو کوئی ان سے تھوڑی سی نیکی کرے یہ ایک کے سو بنا کر واپس لٹاتے ہیں۔ اب اہل قلم کانفرنس ہی کو لیجئے، اس میں جن ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا ان میں وہ مقبول اور پسندیدہ چہرے بھی تھے جو اس انڈسٹری کی آبرو ہیں اور سابقہ حکمرانوں کی تعریف کرتے آئے ہیں۔ اسی شدت سے اب نئی حکومت کو خوش آمدید کہہ

رہے ہیں۔ان میں بعض فن کار ایسے بھی ہیں کہ قصیدہ ایک ہی لکھ چھوڑا ہے اور حکومت کے بدلنے پر صرف عنوان تبدیل کر کے پڑھ دیتے ہیں۔

صاحبو! اس پروگرام کا ایک اور مقصد بھی تھا۔ چھ سات سال مسلسل دوسروں کے شعر سنا سنا کر ہم بھی بالآخر شاعر ہو ہی گئے اور ایک مجموعہ بھی شائع کر دیا ہے۔اس کی رسم افتتاح بھی ہم پر واجب چلی آ رہی تھی' تقریب منانے کا یارانہ تھا کہ اس میں رقم اٹھتی تھی۔سوچا اس پروگرام کو اپنی کتاب کا افتتاحی پروگرام بھی بنا دیا جائے۔

خواتین وحضرات! کتاب حاضر ہے، اسے چیچو کی ملیاں دارالادب نے شائع کیا ہے۔ قیمت صرف 25 روپے ہے۔جو خریدے اس کا بھی بھلا جو نہ خریدے اس کا بھی بھلا۔ہم تو ایک زمانے سے نیکی کر کے دریا میں ڈالتے آئے ہیں۔اب کراچی کی ساحل پر اپنی شاعری کو سمندر میں ڈبو رہے ہیں۔جس کتاب کا یہ غسل فتابی آپ دیکھ رہے ہیں اسے ہم اگلے سال گلڈ انعام کے لئے پیش کریں گے۔ہمارے انعام کے لئے کوشش کیجئے اور ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد کر لیجئے۔

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

حضرات! لمبی چوڑی تمہید کی گنجائش نہیں اس لئے اس مختصر سی عرض داشت پر گزارہ کر لیجئے۔جس ملک میں چار سو صفحات کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کہلاتی ہو وہاں میری یہ سمع خراشی بھی مختصر ہی تصور ہو گی اور اب آیئے اصل پروگرام کی طرف.....

◆❖⌘

(۵)

اشتہارات

مشتری ہشیار باش

ہماری ادبی فیکٹری کے تیار کردہ مال کی مقبولیت دیکھ کر بعض نقّالوں نے اپنے تنقیدی مضامین کو ہماری فیکٹری کا ٹریڈ مارک لگا کر فروخت کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ ہماری مقبول ترین مصنوعات از قسم پاپڑ پڑیاں، بارہ مصالے کی چاٹ، نوآبادیاتی نظام، تضادات، عوام، مزدور، کسان کے مقابلے میں گھٹیا مال پر لیبل لگا کر فروخت کر کے ہماری کمپنی کو شدید مالی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ کاروباری حضرات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ جس مال پر ہماری مہر نہ ہو اسے نہ خریدیں اور فروخت کرنے والے نقاد کے بارے میں ضروری معلومات قریب ترین پولیس سٹیشن کو یا خود ہی ارسال فرمائیں۔

المشتہر
ابوالہول ضیغم الکبریٰ والجملی مالک
ادارہ مارکسیات پاپڑ منڈی، لاہور

تبدیلی نام

میں نے اپنا نام عطاء الحق قاسمی کی جگہ احمد ندیم قاسمی رکھ لیا ہے۔ آئندہ احباب مجھے اسی نام سے یاد فرمائیں۔

العبـــــــــد

احمد ندیم قاسمی سابق عطاء الحق قاسمی

عاق نامہ

میں نے اپنے شاگرد ڈاکٹر سلیم اختر کو بوجہ نافرمانی عاق کر دیا ہے۔ اب وہ اپنے قول و فعل کا خود ذمہ دار ہے۔ اس کی تنقیدی آراء کو آئندہ اسی کی ذاتی آراء تصور فرمائیں۔

الملتمس

ڈاکٹر وزیر آغا' وزیر کوٹ' سرگودھا

یہ بچہ کس کا ہے؟

ایک لڑکا' عمر ساٹھ سال' پیشانی پر داغ غلامی' رنگ گندمی مائل بہ سیاہی' پاؤں نیلے' آنکھوں پر عینک' زبان میں لکنت' چہرے پر وحشت' بوجہ پیری اپنا نام فراموش کر چکا ہے۔ انتظار حسین کے تنور سے کلچے خریدنے آیا تھا کہ گھر کا راستہ بھول گیا۔ ہمیں صحافت کے دوراہے پر بھیک مانگتا ہوا ملا۔ ذہنی طور پر کسی قدر معذور ہے۔ اپنی والدہ کا نام نہیں بتا سکتا۔ آبائی پیشہ کاسہ لیسی اور گداگری بتاتا ہے۔ بعض متفرق باتیں بھی اسے یاد ہیں۔ جوانی میں یونین اسٹ حکومت کا پروردہ تھا۔ قیام پاکستان کے بعد کے واقعات اسے اچھی طرح یاد نہیں۔ اتنا اور بتاتا ہے کہ ہر حکومت کی حسب توفیق خدمت کی اور اجر پایا۔ اکثر انقلاب انقلاب کی گردان کیا کرتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے بعض اوقات سوشلزم' اسلامی سوشلزم' سیکولرازم کے نعرے بھی لگاتا ہے۔ اور اپنا تعلق ایک سے زیادہ سیاسی جماعتوں سے بیان کرتا ہے۔ جس جماعت کا ہو وہ مزید نشانیاں بتا کر لے جائے۔

المشتہر

ادارۂ حفظ ناموس گمشدگانِ ضمیر، مسلم ٹاؤن' لاہور

آ جاؤ کچھ نہیں کہا جائے گا

میرا بیٹا مسمّی موسم کاشمیری بعمر ۳۵ سال، گھر سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔اس کی مادر علمی آج کل سخت علیل ہے اور ہر وقت اسے یاد کرتی ہے۔اگر عزیز موصوف زندہ ہو اور ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے خرکاروں کے چنگل سے آزاد ہو، تو واپس آ جائے اور اپنی والدہ کی تیمارداری کرے۔اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔حتیٰ کہ گھر سے بھاگتے ہوئے جو زیورات اور خیالات چوری کر کے لے گیا تھا اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا جائے گا۔ایسے میں آب حیات سے راہ رسم بڑھانے کی کھلی اجازت ہے۔اس معاملے کے بخیر وخوبی طے ہو جانے کے بعد اس کی مرضی کے مطابق اس کی شادی کسی سرکاری ادارے سے کر دی جائے گی۔

غم زدہ باپ

ریاضت سندیلوی

سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج چیچو کی ملیاں

(۶)

میر جملہ لاہور کا ادبی خبر نامہ

بسلامت نہ ردی

''بجنگ آمد'' والے کرنل محمد خان نے نوجوانوں کی جنسی تربیت کے لئے ''بسلامت ردی'' لکھی تھی۔ اب انہوں نے تعلیم نسواں کے لئے ''بسلامت نہ ردی'' شائع کرنے کا اعلان کیا ہے۔

اردو زبان پولیس مقابلے میں ماری گئی

مشہور جرائم پیشہ خاتون اور کئی غیر ملکی زبانوں کی قاتلہ، جس نے قومی زبان ہونے کا دعویٰ کر رکھا تھا آج پولیس کے ہتھے چڑھ گئی اور مقابلہ میں ماری گئی۔ ہماری نمائندہ خصوصی نے اطلاع دی ہے کہ یہ واقعہ شاہراہ قائداعظم لاہور پر پیش آیا۔ پولیس کے بیان کے مطابق مرحوم ایک عادی مجرمہ تھی اور اکثر پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر جائے واردات سے روپوش ہو جایا کرتی تھی۔ اس نے لاہور کی بعض سڑکوں پر دن دہاڑے کئی ڈاکے ڈالے اور انگریزی زبان کے کئی پٹرول پمپوں پر حملہ کر کے زر نقد بھی حاصل کیا۔ اس پر یہ الزام بھی ثابت ہو چکا ہے کہ بعض سرکاری دفاتر میں اس نے دفتری اصطلاحات کے آتش گیر مادے بھی بموں کی شکل میں رکھ دیئے تھے اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بروقت پتہ چل جانے کی وجہ سے ان ٹائم بموں کی پنیں نکال دی گئیں اور کوئی جانی نقصان نہیں ہوا اس کے علاوہ پولیس کو ایک اغوا کے مقدمے میں بھی اس ملزمہ کی تلاش تھی، آخر ہماری گشتی پارٹی کو اطلاع ملی کہ یہ خوفناک قاتلہ کراچی میں مقتدرہ قومی زبان

کے دفتر کے ایک غسل خانے میں چھپی بیٹھی ہے چنانچہ پولیس نے مقامی رضا کاروں کی مدد سے (جو جائے واردات کے آس پاس اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہوئے اکثر پائے جاتے ہیں) اس خطرناک اشتہاری مجرمہ کو گھیرے میں لے کر گرفتار کر لیا۔ پولیس اسے ہوائی جہاز پر بٹھا کر لا رہی تھی کہ اچانک لاہور کے ہوائی اڈے پر پیاسی کے کارکنوں کی سازش سے ڈاکو خاتون ایک بار پھر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی لیکن لاہور کی پولیس اب خاصی چوکس ہو چکی تھی۔ پولیس کی بیدار مغز قیادت نے بعض کاروں پر اردو میں پلیٹیں دیکھ کر اس کے ٹھکانوں کا پتہ لگا لیا تلاش کے دوران ہی میں شاہراہ قائداعظم پر ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک ڈرائیور کو روکنے پر کار کی تلاشی لی گئی تو اس خوفناک عورت کے اصل عزائم کا حال معلوم ہوا اور پولیس نے اپنی تگ و دو تیز کر دی اور بڑی مستعدی سے پوری سڑک کی ناکہ بندی کر لی۔ اردو کی نمبر پلیٹوں کے سلسلے میں چالان شروع کر دیئے گئے۔ اس پر مفرور قاتلہ کے حامیوں نے پولیس پر خشت باری کی اور ناجائز اسلحے کا استعمال کیا۔ ٹریفک پولیس نے اپنے بچاؤ کے لئے جوابی کارروائی کی۔ اس تصادم میں یہ ڈاکہ زن خاتون ماری گئی پولیس لاش کو وارثوں کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا اصل وارث کون ہے۔

بیٹے کی پیدائش

پروین شاکر بالآخر ایک ڈھنگ کی تخلیق پیش کرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔

ادبی کمیشن کی تشکیل

عبدالعزیز خالد کا اس سال صرف ایک شعری مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس تشویشناک صورت حال کا جائزہ لینے کیلئے رائٹرز گلڈ نے ایک اعلیٰ سطح کا ادبی کمیشن مقرر کیا ہے۔

فلیپ نگاری کا مقابلہ

جناب احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے درمیان پچھلے برس بھی فلیپ نگاری کی دوڑ

جاری رہی۔اب تک احمد ندیم قاسمی کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے ان کا اسکور ۲۳۵۶ فلیپ ہے اور وزیر آغا صرف ۲۳۵۱ فلیپ لکھ پائے ہیں۔توقع ہے کہ اس سال یہ بیدھ کسی نتیجہ خیز مرحلے میں داخل ہو جائے گا،اس امکان کے پیش نظر نیز اس بناء پر کہ اکثر ادیبوں کا تخلیقی اور تحقیقی سرمایہ اب صرف فلیپ ہی رہ گئے ہیں،رائٹرز گلڈ نے اعلان کیا ہے کہ دسمبر ۱۹۰۰ء تک سب سے زیادہ فلیپ لکھنے والے ادیب کو داؤد ادبی انعام دیا جائے گا۔

ادیبوں کا مقابلۂ حسن

اکیڈمی آف لیٹرز اسلام آباد کے بارے میں سنا ہے کہ اس نے اس سال مرد ادیبوں کا مقابلۂ حسن کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔شائقین سے التماس ہے کہ اپنے اپنے قد آدم فوٹو ارسال فرمائیں۔سب سے زیادہ خوبصورت ادیب کو اکیڈمی کی اعزازی رکنیت کے علاوہ عالمی حسیناؤں کی تصاویر کا وہ البم بھی پیش کیا جائے گا جو اکیڈمی نے حال ہی میں اہل قلم کی ڈائریکٹری کے نام سے بصرف زرِ کثیر تیار کیا ہے۔

سِک متراں دی

فرانس کے صدر متراں اگر کبھی پاکستان کے دورے پر آئے تو حفیظ تائب ان کی خدمت میں اپنی کتاب ''سِک متراں دی'' پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

فیض کی واپسی

فیض احمد فیض ماسکو سے اپنا سیاسی چیک اپ کرانے کے بعد عنقریب پاکستان واپس آ رہے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کا نیا شعری مجموعہ

احمد ندیم قاسمی کا تازہ مجموعہ ''دوام'' شائع ہو گیا ہے۔اس سے متاثر ہو کر عطاء الحق

قاسمی نے اپنے زیرِ ترتیب مجموعے کا نام ''حبسِ دوام'' تجویز کیا ہے۔ امجد اسلام امجد نے بھی اطلاع دی ہے کہ قاسمی کی پیروی میں انہوں نے بھی اپنے نئے مجموعے کا نام ''ترکِ دوآم'' رکھا ہے۔

بارے آموں کا کچھ بیان ہو جائے

ڈاکٹر وزیر آغا سخت برہم ہیں کہ احمد ندیم قاسمی نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام سرقہ کر کے ''دوام'' رکھ لیا ہے حالانکہ اس بار آموں کی فصل کے موقع پر وہ خود اپنے تازہ مجموعہ کلام کا نام ''دوآم'' رکھنا چاہتے تھے۔ جو غزل اور نظم دونوں اصناف پر مشتمل تھا۔

اب انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس کا نام ''تین آم'' رکھیں گے اور اس کا تیسرا حصہ بھی ہوگا۔ جو گیتوں پر مشتمل ہے۔

یاد رہے کہ یہ مجموعہ ابھی قلمی صورت میں ہے اور اس کا نام فی الحال ''تین قلمی آم'' ہے۔

یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ کوٹ ادو سے ڈاکٹر انور سدید بھی اپنا کلام شائع کر رہے ہیں جس کا نام ''پیوندی آم'' ہوگا۔

بے وزن اشعار کی سرگزشت

ایک مقامی اخبار میں ڈاکٹر وحید قریشی کے چار شعر چھپے جن میں سے دو شعر اصلاح کر کے خارج از وزن بنا دیئے گئے۔ سنا ہے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے اخبار کے مدیر ادبی کو خط لکھا ہے کہ مہربانی فرما کر باقی کے دو شعروں کو بھی فوراً وزن سے خارج کیا جائے کیونکہ ان کے پاس پہلے ہی وزن بہت زیادہ ہے اور مزید بوجھ اٹھانے کی ہمت نہیں۔

ادب کے ٹوپی بدل بھائی

اہلِ قلم کانفرنس میں ادیبوں کے باہمی تعاون اور خیر سگالی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا

کہ عبداللہ ملک نے سر پر جناح کیپ پہن رکھی تھی اور عطاء الحق قاسمی اور الطاف حسین قریشی نے سروں پر سرخ ٹوپیاں سجا رکھی تھیں۔

قومی شاہراہ پر ایک ادبی حادثہ

ادبی ٹریڈنگ کمپنی کا ایک ٹرک سامان لاد کر قومی شاہراہ پر جا رہا تھا کہ ڈرائیور کے قلم کا ٹائی راڈ کھل گیا جس سے ٹرک ایک ادبی بس سے جا ٹکرایا۔ بس اہل قلم کانفرنس میں شرکت کے لئے مندوبین کو کراچی سے اسلام آباد لے جا رہی تھی' ٹرک حیدر آباد سے کراچی کی سمت روانہ تھا۔ یعنی قریبی حلقوں کا خیال ہے کہ حادثہ دراصل ٹرک کی تیز رفتاری کی وجہ سے پیش آیا۔ ٹرک ڈرائیور پہلے بھی کئی حادثات کا عادی ہے اور اکثر تصادم کے بعد جائے واردات سے فرار ہو جایا کرتا ہے۔ واقف حال ادباء کی رائے ہے کہ بس کے ساتھ یہ ٹکر بھی کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہے جس کے مطابق بعض ادیبوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ مجرم اپنے قلم کا ٹائی راڈ عموماً کھلا رکھنے کا عادی ہے۔ آخری اطلاعات آنے تک چار ادیب جان بحق ہو چکے تھے اور سولہ زخمی قریبی ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ پندرہ شاعری کو مرہم پٹی کے بعد فارغ کر دیا گیا ہے۔ نامور ادیبوں میں ڈاکٹر وزیر آغا' ڈاکٹر تبسم کاشمیری' محمد طفیل (مدیر نقوش) اور صدیق سالک کے نام لئے جا رہے ہیں لیکن ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ ان میں سے موصوف کا پسندیدہ شکار کون سا تھا جس کی خاطر انہوں نے پوری ادبی برادری پر ہلہ بول دیا ہے۔

فوکر طیارے کا پائلٹ

کالم نویس انتظار حسین فوکر طیارے کا وہ پائلٹ ہے جو مسافروں کو سفر کی سہولتیں کم اور ہچکولے زیادہ دیتا ہے۔

مرمت شدہ ادبی ٹیوب ویل کی تنصیب

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنا پرانا ادبی ٹیوب ویل ری کنڈیشن کرا کے کوٹ ادو میں نصب کیا

ہے جس کا نام انور سدید رکھا گیا ہے۔امید ہے اس بندوبست سے علاقے کا نظام آب پاشی ٹھیک ہو جائے گا اور سیم اور تھور کا سد باب ممکن ہوگا۔ بشرطیکہ یہ ٹیوب ویل مقامی ضروریات کی طرف زیادہ توجہ کرے اور ذاتی اشتہار بازی سے پرہیز کرتے ہوئے قلمدار حسین کے فرضی نام سے امروز میں کالم لکھنا بند کر دے۔

انجم رومانی آئی کلینک

ادیبوں کو مژدہ ہو کہ پروفیسر قیوم نظر کی آنکھوں کے کامیاب علاج کے بعد پروفیسر انجم رومانی نے آنکھوں کے معالج کی حیثیت سے باقاعدہ کلینک کھولنے کا اعلان کر دیا ہے۔مریض کے لئے ادیب ہونا ضروری ہے اور پہلے سے نابینا ہونا بالکل ضروری نہیں۔

محتاج کو داتا دے

مشہور استاد ادیب کرگس سندیلوی اپنے تعلیمی ادارے سے ریٹائر ہونے کے بعد حکومت سے مالی امداد کے طلبگار ہیں۔ان کا مطالبہ ہے کہ اب انہوں نے نصابات کی تدوین سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے اور صاحب نصاب نہیں رہے۔اس لئے زکوٰۃ فنڈ سے مستقل ماہانہ وظیفے کے حق دار ہیں۔

نئی ادبی انجمن کا قیام

ان جملہ ادیبوں نے جن کی وجہ شہرت ان کی بیگمات ہیں، اپنے شوہرانہ حقوق کی حفاظت کے لئے ایک انجمن قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔انجمن کے بانی اراکین کا دعویٰ ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں ایک عرصے سے مظلوموں کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہے۔اور مرد ادیبوں پر عورتوں کے بورژوا طبقے کا تسلط ہو چکا ہے لیکن تیسری دنیا کے عوام ادیب زیادہ دیر تک یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتے۔اس لئے ایک انجمن کا قیام از بس ضروری ہے۔اس کا نام ''انجمن ترقی پسند شوہران'' تجویز ہوا ہے۔اور منشور بھی عنقریب شائع کیا جائے گا۔بانی اراکین میں یوسف کامران

(شوہر کشور ناہید) ظہیر بابر (شوہر خدیجہ مستور) احمد علی خان (شوہر ہاجرہ مسرور) اشفاق احمد (شوہر بانو قدسیہ) کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ترقی پسند تحریک

یہ ایک دکان ہے جس میں ادبی مال شوکیسوں میں اور فروخت کے لئے سیاسی مال کاؤنٹر پر رکھا جاتا ہے۔

روحانی تحریک

جس تحریک کو انجم رومانی چلائیں وہ روحانی تحریک کہلاتی ہے۔

راسخ عرفانی کا بارہواں مجموعہ

راسخ عرفانی کا بارھواں مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔اس سے پہلے وہ گیارہ مجموعوں اور گیارہ فرزندوں کے خالق تھے۔اہل گوجرانوالہ مجموعے کے بعد بارھویں فرزند کے لئے چشم براہ ہیں۔

ایک اہم قرارداد

اہل قلم کا یہ اجتماع مطالبہ کرتا ہے کہ آئندہ ڈاکٹر وزیر آغا کے حامی ادباء گہرے سبز رنگ کی وزیر آغا کیپ پہنا کریں کیونکہ اس طرح بہ آسانی اولوں سے سر بچایا جا سکتا ہے۔قاسمی گروپ کے لئے لازم ہے کہ قاسمی کٹ بال رکھیں کیونکہ اس سے نائی کا خرچ بھی بچتا ہے اور لمبی نظمیں کہنے میں بہت مدد ملتی ہے۔فیض گروپ کے لئے لازم ہے کہ مونچھیں بالکل نہ رکھے کیونکہ بعض اوقات مونچھیں نیچی بھی کرنی پڑ جاتی ہیں۔اظہر جاوید گروپ کے لئے اب ضروری ہو گیا ہے کہ مونچھیں رکھ لیں تا کہ لمبے بالوں کی وجہ سے خواتین ہونے کا دھوکہ نہ ہو سکے نیز حسب موقع مونچھوں کو تاؤ بھی دیا جا سکے۔

اکیڈمی آف لیٹرز کا آئندہ منصوبہ

ایک ایسے ادبی جریدے کا اجراء جس میں صرف ان ادیبوں کو لکھنے کی دعوت دی جائے

گی جن کے قلم سے اب تک دستخطوں کے سوا کوئی چیز برآمد نہیں ہوسکی۔ بصورت نایابی تحریر رسالے میں خوبصورت دستخطوں کا عکس شائع کیا جائے گا۔

پروگرام نہیں ملے گا

ٹی وی پروگرام میں شرکت کے خواہش مند ادیبوں اور شاعروں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ہمارے جملہ پروڈیوسروں نے اپنے اپنے شعری مجموعے شائع کر دیئے ہیں۔ ادباء کو حکم دیا جاتا ہے کہ پروڈیوسروں کو مدعو کریں اور ان کے ساتھ شامیں منائیں۔ خلاف ورزی کرنے والے ادیبوں کے چیک روک لئے جائیں گے اور آئندہ انہیں کوئی پروگرام نہیں دیا جائے گا۔

مشفق خواجہ پاکستان کا ہنری کیسنجر

مشفق خواجہ خیر سگالی کے دورے پر لاہور آئے۔ انہوں نے یہاں پر کئی ادیبوں کی صلح کرائی۔ کراچی میں عالی اور محمد طفیل کے درمیان بھی بڑی کامیابی سے مذاکرات کرائے اور بالآخر کامیاب رہے۔ سنا ہے ان کی ان کامیابیوں سے متاثر ہوکر بعض حلقے سوچ رہے ہیں کہ اب انہیں اسرائیل اور لبنان نیز ایران اور عراق کے درمیان صلح کی گفت وشنید کے لئے مشرق وسطیٰ کے دورے پر روانہ کر دیا جائے۔ ہنری کیسنجر کے بعد صلح جوئی میں سب سے زیادہ کامیاب مشفق خواجہ رہے ہیں اس لئے کراچی کی ایک انجمن انہیں ''پاکستان کا ہنری کیسنجر'' کا خطاب دینے والی ہے۔ تقریب کے لئے عنقریب دعوت نامے جاری کئے جائیں گے۔

رینے گون ہوگیا ہے

کراچی میں محمد حسن سکری کے بعد رینے گون کا عارضہ سلیم احمد کو ہوا تھا۔ اب یہ مرض لاہور تک پہنچ گیا ہے۔ اس کے پہلے شکار تحسین فراقی تھے۔ دوسرا مریض سراج منیر ہوا ہے۔ وبائی امراض کے ماہر نقاد حفاظتی ٹیکے تجویز کر رہے ہیں۔ فرانسیسی نقادوں کے اقوال وبا سے بچانے میں بہت کامیاب رہے ہیں، تاہم گرمیوں میں یہ مرض مہلک بھی ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ اس سے جسم

میں پانی کی مقدار خاص کم ہو جاتی ہے اور نمک بھی خارج ہو جاتا ہے۔تحریر کی بے تکی دور کرنے کے لئے حکیم عطاء الحق قاسمی کا قرص قاسمی مفید پایا گیا ہے۔ضرورت مند دفتری اوقات میں ''دوائے وقت'' کے دفتر سے یہ دوا مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ہومیو پیتھک علاج بھی بعض حالتوں میں مفید رہا ہے۔اس کے لئے ،مشہور لٹو گھمانے والے حسن رضوی سے رجوع کیا جائے۔تازہ اطلاعات کے مطابق ابھی تک مرض پر قابو نہیں پایا جا سکا۔اس لئے ادبی کارپوریشن کے مدیر نے عملہ تہ داری کو خبردار کر دیا ہے کہ ہنگامی صورت حال سے نپٹنے کے لئے چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر حاضر رہے۔گورکنوں کو بھی چوکس رہنے کی ہدایات جاری کی جا چکی ہیں۔حلقہ ارباب ذوق کے جملہ قبرستان میں قبریں کھودنے کا معقول بندوبست کر دیا گیا ہے۔تازہ اطلاعات کے مطابق ادبی گورکنوں نے اپنے ریٹ بڑھا لئے ہیں لیکن حکومت ادبستان نے انہیں خبردار کیا ہے کہ حکومت نرخوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے اور ضابطے کی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔گورکنوں نے اخباری بیان جاری کیا ہے کہ اگر حکومت ان کی معاوضے کی شرح پر نظر ثانی نہیں کرتی اور نئے بجٹ میں انہیں اس کے لئے معقول رقم کا بندوبست نہیں ہوتا تو وہ اپنے مالی مفادات کے تحفظ کے لئے ''انجمن ترقی پسند گورکنان پاکستان'' کے نام سے ایک ایکشن کمیٹی قائم کریں گے اور حکومت ادبستان کے سامنے ہرگز ہرگز ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔سرکاری ترجمان کے اندازے کے مطابق صورت حال ابھی تک قابو میں ہے۔جب بے قابو ہو گئی تو پھر دوسرا اعلامیہ جاری کر دیا جائے گا۔مسلسل بے قابو رہی تو مسلسل اعلامیے جاری کئے جاتے رہیں گے۔

ملازمت چھٹ ادیب

اردو کے سب سے بڑے ''ملازمت چھٹ'' ادیب سراج منیر نے ''نوائے وقت'' چھوڑ کر ''اردو ڈائجسٹ'' میں ملازمت کر لی ہے۔یہ دوسری بات ہے کہ یہ خبر چھپنے تک وہ ''اردو ڈائجسٹ'' چھوڑ کر ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں جا چکے ہوں گے۔تاہم آخر اطلاعات آنے تک وہ خیریت سے تھے اور اپنی ملازمت پر قائم تھے لیکن ان کی دیرینہ شکایت کا ازالہ ابھی تک نہیں ہو

سکا۔انہیں شکایت ہے کہ آج کل کے زمانے میں کوئی ڈھنگ کا مالک ہی نہیں ملتا جو مخلص، فرماں بردار ہو اور نوکر کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھ سکے۔جب کوئی مالک حکم عدولی کرتا ہے انہیں مجبوراً استعفیٰ دینا پڑ جاتا ہے۔

مظفر وارثی کا نیا مجموعہ

مظفر وارثی: ''میں نے نیا مجموعہ تیار کیا ہے، شائع کر رہا ہوں''۔

تحسین فراقی: ''کس نام سے؟''

مظفر وارثی: ''اپنے نام سے''۔

مٹی کا مادھو

زاہد ڈار عرف مادھو کا مجموعہ کلام ''مٹی کا مادھو'' کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

ادب کا کوٹہ سسٹم

ادب میں دبستانوں کی بات چلی تو ہمارے ایک کرم فرما نے کہا کہ ادب میں دبستان نہیں ہوتے ادب میں تحریکیں ہوتی ہیں۔خدا جانے وہ کس دور کی بات کرتے ہیں۔ادب کا کوئی دور ایسا ضرور ہو گا جب تحریکیں ہوتی ہوں گی، اب صرف دبستان ہوتے ہیں اور ان کا تعلّق بھی بعض شہروں سے ہے۔جیسے دبستان کراچی، دبستان سرگودھا، دبستان راولپنڈی، دبستان ملتان اور دبستان لاہور، ادب بٹ بٹا کر اور کٹ کٹا کر دبستان ہو گیا ہے، اب تو ادب کے محلے وار دبستان پیدا ہونے لگے ہیں۔لاہور کا حال یہ ہے کہ ''گلشن اقبال'' کے ادیبوں کا اپنا تشخص ہے، انارکلی کے ادیبوں کا اپنا اور کرشنا نگر کے ادیب اپنا جدا دبستان رکھتے ہیں۔جب سے پنجاب میں نئے نئے ڈویژن وضع کرنے کی رسم چلی ہے ادیبوں نے بھی انہیں خطوط پر سوچنا شروع کر دیا ہے۔پہلے انجمنوں اور کانفرنسوں میں ادباء کی نمائندگی آل پاکستان بنیاد پر ہوتی تھی پھر سرکاری دفتروں میں صوبائی کوٹے کا چکر چلا تو ادیب بھی صوبائی بنیادوں پر نمائندگی مانگنے لگے۔سندھ، سرحد،

بلوچستان اور پنجاب کا کوٹہ مقرر ہوا اور ادیبوں کو دعوت ناموں کے راشن کارڈ جاری ہونے لگے۔ادب کا معیار ادیب کا مرتبہ نہ رہا اس کا علاقائی استحقاق بن گیا۔اہل قلم کانفرنس میں شرکت کے لئے ڈویژن وار نمائندگی ہو گی تو لاہور شمالی اور لاہور جنوبی کی پالیاں الگ الگ بیٹھیں گی' گوجرانوالہ' سیالکوٹ' فیصل آباد اور دوسرے ڈویژن بھی اپنے اپنے نمائندے بھیجیں گے۔سنا ہے اکیڈمی آف لیٹرز عنقریب ایک اشتہار شائع کرنے والی ہے جس میں ڈویژن وار ادیبوں سے درخواستیں طلب کی جائیں گی کہ وہ اپنے ادیب ہونے کا حلف نامہ داخل کریں تا کہ انہیں اگلے سال اہل قلم کانفرنس میں دعوت دی جا سکے۔

ایک مصدقہ خبر

جناب حشرت رحمانی نے ''عشرت رفتہ'' کی بجائے اپنی سرگزشت کا عنوان ''عشرتے ازکار رفتہ'' تجویز کیا ہے۔سنا ہے ان کی بیگم نے اس خبری تصدیق کر دی ہے۔

وارث میر یا وائرس میر

انگلستان سے وائرس میر کی آمد نے لاہور کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔سنا ہے اس مرض کا ابھی تک حتمی علاج دریافت نہیں ہوا۔ڈاکٹر صرف پرہیز پر زور دے رہے ہیں۔

ادب کی کلیئرنس سیل

ایک مہینہ آپ کا' گیارہ مہینے ہمارے' شاعری کی کلیئرنس سیل' سال میں گیارہ شعری مجموعے مفت حاصل کیجئے۔

ہم ہیں آپ کے نیاز مند میسرز عبدالعزیز خالد اینڈ کمپنی۔

بابا تلقین شاہ کا نیا کنٹریکٹ

''اور ڈرامے'' میں اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کامیاب کوشش پر ٹیلی ویژن کے ارباب بست وکشاد نے نئی سیریز کا کنٹریکٹ بابا تلقین شاہ کی بیگم کو دے دیا ہے۔

بچوں کے لئے نادر تحفہ

عید کی خوشیوں کے موقع پر اپنی معنوی اولاد کو دیدہ زیب اور پائے دار محاورے پہنائیے، جو دلفریب پیکنگ میں ہماری دکان سے دستیاب ہیں۔ ہمارے شوروم واقع دفتر روزنامہ ''مشرق'' لاہور میں تشریف لائیں۔ سکّہ بند محاورہ بازوں کے لئے خاص رعایت یہ ہے کہ قیمت بعداز فروخت ادا فرمائیں۔ اس کے لئے کسی بینک گارنٹی کی بھی ضرورت نہیں۔ انتظار حسین صاحب سے براہ راست خریدنے والوں کو تازہ محاوروں پر پچاس فیصد اور باسی محاوروں پر بیس فیصد کمیشن دیا جاتا ہے۔ برف میں لگے ہوئے سو سال پرانے محاورے ارزاں نرخوں پر آثار قدیمہ کے شائقین کو مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ استعمال شدہ محاوروں کی مرمت کا کام بھی حسب منشا سستے داموں ہماری ورکشاپ میں کیا جاتا ہے۔ شوقین اہل قلم کے لئے نادر محاورے پولیتھین کی تھیلیوں میں بند کر کے ڈاک کے ذریعے بھی روانہ کرنے کا انتظام ہے۔ تھوک مال کی سپلائی کے لئے پاکستان نیشنل سنٹر الفلاح بلڈنگ شاہراہ قائداعظم لاہور سے رجوع فرمائیں۔ پرچون کے لئے انتظار حسین میرٹھی تاجر چرم محاورات نانی اماں کی کٹیا چوھٹہ مفتی باقر اندرون شہر سے حاصل کریں۔ طغلانہ محاوروں کے لئے حال ہی میں نیا بندوبست کیا گیا ہے۔ ماں کے دودھ کے بعد سب سے زیادہ غذائیت سے بھرپور محاورے آپ کی درازی نسل کے ضامن ہیں۔ ہم نے اپنے کرم فرماؤں کی خاص سہولت کے لئے اسلام آباد میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے دفتر سے بچگانہ محاوروں کو ٹین کے ڈبوں میں بارعایت سپلائی کا اہتمام کیا ہے جہاں ہمارا خاص نمائندہ آپ کی ہر ضرورت کو پورا کرے گا۔ حفظان صحت کے اصولوں کے عین مطابق نسوانی ہاتھوں سے پیک کئے ہوئے ڈبے آپ کی خوش ذوقی کی ضمانت ہیں۔

پی ایچ ڈی کے امیدواروں کو مشکلات کا سامنا

جب سے حکومت نے وزن کے پیمانے بدلے ہیں کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کوئی

مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ پی ایچ ڈی کے قواعد کے مطابق اردو پی ایچ ڈی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ مقالے کا وزن کم از کم پانچ سیر ہو۔ اعشاری نظام رائج ہونے کے بعد سے پرانے باٹ استعمال کرنا جرم قرار دیا گیا ہے اس لئے ایک تجویز یہ ہو رہی ہے کہ مقالے کا کم از کم وزن نئے حساب سے پانچ کلو کر دیا جائے لیکن بعض فضلا کو اس سے شدید اختلاف ہے۔ ان کی رائے میں اس سے پرانے ہیں ایچ ڈی حضرات کی حق تلفی ہوگی۔ گمان غالب یہ ہے کہ اب سابقہ امیدواروں کے پانچ سیر کو ساڑھے چار کلو کے برابر شمار کیا جائے گا۔ معاملہ سنڈیکیٹ کی آئندہ نشست میں زیر غور آئے گا۔

ادبی بحران کی سرگزشت

اردو رسائل کی ضخامت میں ''نقوش'' نے خاص اختصاص پیدا کیا تھا۔ اس امتیاز کو چھیننے کے لئے عطاء الحق قاسمی نے لاہور ہی سے 786 صفحات پر مشتمل ''معاصر'' شائع کر دیا جس کے ساتھ ہر خریدار کو ایک ایک مزدور مفت مہیا کرنے کا بندوبست تھا۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ وہ مزدور تھے جو چند ماہ پہلے عطاء الحق قاسمی نے اپنے مکان کی تعمیر پر لگا رکھے تھے اور مکان کی تکمیل کے بعد بے روزگاری کا شکار تھے۔ اب کراچی کے مشفق خواجہ نے ''تخلیقی ادب'' کے اجراء کے بعد ''بازیافت'' کا اعلان کیا ہے۔ جس سے پورے کراچی کے مزدوروں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے کیونکہ خواجہ صاحب نے قارئین کو رسالے کے ہمراہ ایک ایک بریف کیس دینے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ جس میں پرچہ بند کر کے ہر قاری اسے آسانی سے خود اٹھا سکے گا۔ اس خبر کے بعد کراچی کے شہر وادب کے مزدور حلقوں نے خواجہ صاحب کو اپنا فیصلہ واپس لینے کی دھمکی دی ہے۔ مزدور انجمنیں اس بارے میں ایک وفد بھی خواجہ صاحب کے پاس بھیجنے کا ارادہ رکھتی ہیں اور ناکامی کی صورت میں ایک جلوس بھی نکالا جائے گا۔ جس کی قیادت بعض ادیب خواتین کریں گی۔ خواجہ صاحب پر اس کا خاطر خواہ اثر پڑنے کا امکان ہے بلکہ سنا ہے کہ انتہائی اقدام سے ڈر کر مشفق خواجہ

نے پرچے کو دو حصوں میں شائع کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ ادبی راہنماؤں نے اس صورت حال پر اطمینان کا اظہار بھی کیا ہے لیکن خواتین ادیبوں نے ایک نئی شرط بھی عائد کر دی ہے کہ مشفق خواجہ ہر جانے کے طور پر اپنی تحریر بھی ہر پرچے میں شائع کیا کریں اور مختلف شہروں میں ''تخلیقی ادب'' اور ''بازیافت'' کی تقریبات کا اہتمام بھی کریں لیکن مشفق خواجہ اس پر آمادہ نہیں کیونکہ وہ خواہ مخواہ عطاء الحق قاسمی کی روزی پر لات مارنے پر تیار نہیں، نہ اپنی تحریر شائع کر کے بیگم کی پریشانی کا خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تصاویر اور سینٹیل کالج میگزین میں دیکھ کر پہلے ہی خاصے سہمے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالنے کے حق میں نہیں ہیں۔ احتجاجی سیلاب کے بارے میں صحافی حلقوں کی رائے ہے کہ اگرچہ ان حالات کا اثر ہمسایہ شہری پر بھی پڑنے کا امکان ہے، تاہم صورت حال فی الحال قابو میں ہے اور دانشمند ادباء امکانی تبدیلیوں کا بنظر غائر مطالعہ کر رہے ہیں۔ اگر خطرہ زیادہ ہو گیا تو ادبی چوکیدار کراچی کے مکینوں کو بروقت خبردار کر دیں گے۔ خواتین ادیبوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانے کا معقول اور باپردہ انتظام کر دیا گیا ہے۔ مرد ادباء اپنی حفاظت کے خود ذمہ دار ہوں گے۔

تبادلے یا تبدیلی جنس

قائم نقوی کو ماہ نو کی کشور ناہید بن دیا گیا ہے اور کشور ناہید پاکستان سنٹر (لاہور) کی اعزازی احمد آذر قرار پائی ہیں۔

حرفِ شکایت

مرزا ادیب کو شکایت ہے کہ انہیں اس بار بھی ادب کا نوبل پرائز اس لئے نہیں مل سکا کہ اجلاس میں جمیل الدین عالی شریک تھے۔ سنا گیا ہے کہ مرزا صاحب کو ناکام بنانے کے لئے عالی صاحب خاص طور پر ہوائی جہاز پر سوار ہو کر ''جائے حادثہ'' پر پہنچے تھے۔

ملتانی نصاب کی تدوین نو

بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے ایم اے اردو کے نصاب میں رجسٹرار یونیورسٹی عرش صدیقی کے افسانوں کا مجموعہ اس لئے شامل نصاب نہیں ہو سکا کہ اراکین کے فیصلے کے مطابق نصاب میں رجسٹرار اور وائس چانسلر دونوں کی ایک ایک کتاب شامل ہونی چاہئے۔ وائس چانسلر ابھی تک اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع نہیں کر سکے۔

اس لئے عرش صدیقی کو کچھ عرصہ اور انتظار کرنا پڑے گا:

امید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد
در انتظار ھما دام چیدنم بن گر

بدل یا نعم البدل

اقبال ساجد نے اعلان کر دیا ہے کہ آئندہ سے وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے حلقۂ اثر میں شامل ہو گئے ہیں۔ ادبی حلقوں کو ابھی یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس میں فائدہ کس کو ہوا ہے اور نقصان کس کا ہے۔ بہرحال ڈاکٹر سلیم اختر کے اخراج سے جو Vacancy ہوئی تھی وہ پر ہو گئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر وزیر آغا کو بدل عطا کر دیا ہے۔ خداوند تعالیٰ نومولود کو صحت اور درازی عمر عطا فرمائے۔

سماسکانہ دو عالم میں مرد آفاقی

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی ملتان سے واپسی کے بعد اہل ملتان ادبی خلا کو بری طرح محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ اہل لاہور نے خانہ پری کے لئے طاہر تونسوی کو واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لاہور میں آئندہ تکیے اور لحاف صرف روئی سے بھرے جایا کریں گے۔

آئندہ انعامات نقد وصول کریں

آئندہ برس کے لئے گلڈ نے انعامی مقابلے کے لئے ابھی سے اعلان کر دیا ہے۔

سیکرٹری کے اعلان کے مطابق پنجابی کتابوں کے جملہ شرکاء کو انعام دیا جائے گا۔ اندازہ ہے کہ دو ہزار کتابیں شریک مقابلہ ہوں گی اور ایک ہزار کی خطیر رقم مصنفین میں مساوی طور پر تقسیم کر دی جائے گی یعنی فی مصنف آٹھ آنے۔ انعام بذریعہ منی آرڈر وصول کرنے کی صورت میں فیس بذمہ مصنف ہوگی۔ ادباء سے استدعا ہے کہ اپنی اپنی اٹھنی گلڈ کے دفتر سے نقد وصول فرمالیں۔

سوال و جواب

سوال: سراج منیر اور منیر نیازی میں کیا فرق ہے؟

جواب: پس و پیش کا۔

سوال: مظفر محمد علی اور زیبا محمد علی میں قدر مشترک کیا ہے؟

جواب: اداکاری۔

سوال: ناصر زیدی اور اسرار زیدی میں وجہ مشابہت کیا ہے؟

جواب: زلفیں۔

مجید امجد کا دورہ پاکستان

عوام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ دسمبر کے پہلے ہفتے میں مجید امجد دو روز کے لئے عالم بالا سے نجی دورے پر پاکستان تشریف لائیں گے۔ لاہور میں ان کا بے حد مصروف دن گزرے گا۔ صبح وہ ڈاکٹر خواجہ زکریا کے مکان کا سنگ بنیاد رکھیں گے۔ سہ پہر کو جاوید قریشی کی صدارت میں ایک محفل ہوگی جس میں مجید امجد حاضرین کو اپنا تازہ کلام سنائیں گے جسے بعد میں خواجہ زکریا پانچویں مجموعے کے طور پر شائع کر دیں گے۔ شام کو منیر نیازی کے گھر جا کر عیادت کی جائے گی اور رات گئے پشاور روانگی ہوگی جہاں وہ تاج سعید سے اپنی سابقہ کتاب کی رائلٹی خود وصول کریں گے۔

جب میں بچہ تھا

مذکورہ موضوع پر جب بچوں کے صفحات کے لئے ابوالاثر حفیظ جالندھری سے انٹرویو کیا گیا تو انہوں نے اپنی جوانی اور بڑھاپے کی ساری باتیں بیان کر دیں۔ سنا ہے بچوں نے ان باتوں کو اپنے بار کے عین مطابق پا کر بہت پسندیدگی کا اظہار کیا اور تالیاں بجائیں۔

1978ء کے بہترین مقالات

1978ء کے بہترین مقالات مرتبہ سجاد نقوی شائع ہو گئے ہیں۔ حسب توقع ہیڈ آفس سرگودھا کے ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید کے مقالے بہترین قرار پائے ہیں۔ ایک مقالہ لاہور ریجنل آفس کا اور ایک کراچی آفس کا بھی شامل اشاعت ہے۔ دو مقالے اس بناء پر منتخب ہوئے ہیں کہ فاضل مقالہ نگاروں نے ڈاکٹر وزیر آغا کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی تھی۔ باقی دو مقالے بقائے باہمی کے اصول پر انتخاب کئے گئے ہیں۔ آئندہ سال کا انتخاب بھی زیر ترتیب ہے اور بقائے باہمی کی دونوں سیٹیں بکنگ کے لئے خالی ہیں۔ کاروباری حضرات کے لئے سرمایہ کاری کا نادر موقع ہے۔

درخواستیں مطلوب ہیں

میجر آفتاب حسن کے قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ اس سال بھی اردو کو قومی زبان بنانے کے پروگرام پر عمل نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ کراچی میں ابھی مزید حاجت مندوں اور مساکین کی خاصی تعداد موجود ہے۔ اس لئے اس سال مقتدرہ میں زبان کے بجٹ میں دو سو نئی آسامیاں تجویز کی جا رہی ہیں۔ اس مقصد کے لئے سال خوردہ، جہاں دیدہ اور لبِ گور رسیدہ امیدواروں کی درخواستیں مطلوب ہیں۔ جو امیدوار انٹرویو کے لئے بوجہ جسمانی معذوری نہ آ سکتے ہوں وہ اپنی جگہ کسی عزیز کو ''عوضی امیدوار'' کے طور پر بھیج سکتے ہیں۔ درخواستیں امیدوار

کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہونی چاہئیں۔ تاہم دست و بازو سے محروم حضرات درخواست ٹائپ کرا کر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ اگر کوئی امیدوار کانوں سے بہرا ہوگا تو یہ خوبی اضافی صلاحیت تصور کی جائے گی اور امیدوار کو ملازمت میں ترجیح دی جائے گی۔ خاص حالات میں اسے تنخواہ کا انتہائی گریڈ بھی دیا جا سکتا ہے۔

انور سدید کی نئی کتابیں

تازہ خبر آئی ہے کہ انور سدید کی کتاب ''ذکر اس پری وش کا'' انشائیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ڈاکٹر وزیر آغا کی حمایت میں لکھے گئے مقالات پر مشتمل ہے۔ انشائیوں کے مجموعے کا نام ''شاہ کے مصاحب'' رکھا گیا ہے۔

تحسین فراقی کا شعری مجموعہ

تحسین فراقی اپنی غزلیات کا مجموعہ ''خراج تحسین'' کے نام سے شائع کرنے والے ہیں۔ سنا ہے انتساب ان کی پسندیدہ گلوکارہ اقبال بانو کے نام ہوگا۔

نجیب احمد، خالد احمد بنام ستار سید

عزیزی ستار سید،

ہم آپ کا مسودہ واپس کرنے کو تیار ہیں لیکن صورت احوال یہ ہے کہ جس کاتب کو دیا تھا اس نے اس میں اپنا کلام بھی شامل کر دیا۔ سارا کلام یوں گھل مل گیا ہے کہ اب ہمارے لئے آپ کی غزلیں الگ کرنا دشوار ہے۔ مہربانی فرما کر خود تشریف لائیں اور اپنا کلام چھانٹ کر لے جائیں۔

والسلام

ہم ہیں آپ کے ناشرین

خالد احمد و نجیب احمد

ظفر اقبال کا نیا کالم

حال ہی میں ظفر اقبال نے اپنے کالم کا نام بدل دیا ہے۔اب عنوان ہوگا۔

''سرخیاں ان کی سرخے ہمارے''

ڈاکٹر صفدر محمود اور تبدیلی محکمہ جات

دوستوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ ڈاکٹر صفدر محمود صبح اٹھ کر لباس بدلتے ہیں تو ساتھ ہی اپنا محکمہ کیسے تبدیل کر لیتے ہیں۔

ادبی تجاوزات کے خلاف مہم

ادبی میونسپل کارپوریشن سرگودھا کے میئر ڈاکٹر وزیر آغا نے ادبی تجاوزات کے خلاف مہم کا آغاز کر دیا ہے۔خان پور' کوٹ ادو اور بہاولپور کے ''کھوکھا شکن'' عملے کو حکم دے دیا گیا ہے کہ فوراً لاہور پر چڑھائی کر کے قاسمی چوک پر قبضہ کر لیں اور جہاں جہاں ادبی ورک شاپیں تھڑوں پر قائم ہیں انہیں فی الفور مسمار کر دیا جائے۔

بین الاقوامی ادبی میلہ

حلقہ ارباب ذوق نے اگلے سال ایک بین الاقوامی ادبی میلے کا اہتمام کیا ہے جس کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہیں۔لوہاری دروازے کی بجائے مینار پاکستان کے پاس ایک پنڈال لگایا جائے گا جس میں بوڑھے ادیبوں کی حنوط شدہ ممیاں رکھی جائیں گی۔انگوٹھا چوسنے والے نومولود ادیبوں کی پرورش کا معقول بندوبست بھی ہوگا۔اس مقصد کے لئے سرگودھے سے اعلیٰ نسل کی گائیں منگوائی جا رہی ہیں۔لاہور میں دودھ کی قلت کے پیش نظر رقیب حلقوں کو بھی سٹال لگانے کی کھلی اجازت دے دی گئی ہے۔ان سٹالوں پر دودھ کے چند ڈبے بارعایت فروخت ہوں گے اور امریکی اور روسی ساخت کے فیڈر بھی تقسیم کئے جائیں گے۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنّفین کی سزایابی

انگریزوں کے سامراجی عزائم کو طشت از بام کرنے کے لئے حال ہی میں ایک ادبی جماعت قائم ہوئی ہے جس نے یہ پروگرام بنایا ہے کہ فورٹ ولیم کے مصنفین کو سزا دی جائے اور ان کی جملہ اردو کتابیں انتہائی غلط چھاپی جائیں۔اس عظیم قومی فریضے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ڈاکٹر عبادت بریلوی کی خدمات حاصل کی جا چکی ہیں۔تفصیلات کا انتظار ہے۔

ادبی ٹیوشن سنٹر

آج کل ٹیوشن سنٹروں کا کاروبار زوروں پر ہے۔ لیجئے ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی لاہور والے مکان کے کوٹھے پر دبستان سرگودھا کھول دیا ہے۔

ایک حکایت

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ' پچھلے برس کا ذکر ہے کہ بابا تلقین شاہ کے وزیر ثقافت بن جانے کی خبر آئی تھی۔اس وقت سے ادیبوں کے مختلف دھڑوں کے درمیان حصول قرب کی کشمکش جاری ہے۔کشور ناہید گروپ انہیں اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہا ہے اور انتظار حسین گروپ اپنی طرف گھسیٹ رہا ہے۔اس کھینچا تانی میں بابا جی کی ٹانگیں کشور ناہید گروپ کے حصے میں آئیں گی اور سر انتظار حسین گروپ کے پاس رہ جائے گا۔پس معلوم ہوا کہ جہاں جس چیز کی کمی ہوتی ہے قدرت اسے پورا کر دیتی ہے۔

گانے کا عالمی ریکارڈ

مبارک احمد نے نثری نظم گا کر پڑھنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔ان کے عقیدت مندوں نے طے کیا ہے کہ آئندہ ہر جگہ انہیں کا ریکارڈ بجایا جائے گا۔

تقریر نہیں ہوگی

حفیظ جالندھری مشاعروں میں صرف شعر سنایا کریں گے اور تقریر نہیں کیا کریں گے

کیونکہ تقریر کرنے سے اب ان کا گلا بیٹھ جاتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

صدیق سانپوں والے نے ایک ایسا سانپ دریافت کیا ہے جس کے پھن پر انسانی چہرے کی تصویر ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے خدوخال ایک انقلاب پسند صحافی سے بہت ملتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کلچر کی حفاظت

پنجابی ادبی سنگت نے اپنے ایک حالیہ اجلاس میں اس بات پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے کہ جدید طرز زندگی نے پنجاب کی ثقافت کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ طے پایا ہے کہ پنجابی کلچر کی حفاظت کے لئے آئندہ سنگت کے اراکین ریل کی بجائے بیل گاڑی میں سفر کیا کریں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا اعلان

ڈاکٹر سلیم اختر نے اعلان کیا ہے کہ اگر کسی نے ان کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کے تازہ ایڈیشن کے کسی حصے پر اعتراض کیا تو اگلے ایڈیشن میں اس ادیب کا نام کتاب سے خارج کر دیا جائے گا۔

اصلی خامہ بگوش

کراچی سے تازہ خبر آئی ہے کہ ''سخن در سخن'' کے خامہ بگوش دراصل حمزہ فاروقی ہیں۔ انہوں نے اس کا تحریری طور پر اقرار بھی کر لیا ہے۔ اہل لاہور ان کے دوسرے فوری اعلان کا انتظار کر رہے ہیں جس کے مطابق ''فکاھیات'' کے کالم نویس میر جملہ لاہوری بھی بالآخر میر حمزہ فاروقی نکلیں گے۔

اللہ جمیل ویحب الجمال

پہلے تو ہم سمجھتے تھے کہ کراچی ساحلی شہر ہے جہاں صرف اونٹ ملتے ہیں لیکن اب

معلوم ہوا ہے کہ کراچی میں اونٹ کم اور صاحب جمال لوگ زیادہ بستے ہیں۔صرف ادیبوں ہی کو لیجئے تو ایک سے ایک نامی ''جمیل'' پڑا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی (لکھائی والے) جمیل احمد (چھپائی والے) قصر جمیل (مار پھٹول والے) جمیل الدین عالی (مول تول والے) جمیل احمد خان (جاسوسی مشن والے) جمیل نقوی (پنشن والے) جمیل اختر خان (تقریروں والے) غرض کہ حسیناؤں کا ایک پورا قافلہ ہے جو ایک دوسرے کے عقب میں رواں دواں ہے۔

ادبی نشانہ بازی کا مقابلہ

حسن رضوی اور عطاء الحق قاسمی کے درمیان ادبی نشانہ بازی کا مقابلہ ہونے والا ہے۔ یاد رہے کہ حسن رضوی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر فائر کرتے ہیں۔عطاء الحق قاسمی دوسروں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر نشانہ لگاتے ہیں۔

تارڑ کے بارے میں خصوصی رپورٹ

عطاء الحق قاسمی نے ایک خصوصی بلیٹن شائع کیا ہے جس کے مطابق مستنصر حسین تارڑ نے اپنے نام کے آخری حصے کی طرح کا ایک سنگلاخ ناول لکھنا شروع کیا ہے جس کے جملہ کردار نامور ادیبوں کے کارناموں پر مشتمل ہوں گے۔جن ادباء کے اصلی یا فرضی کارنامے ابھی تک منظر عام پر نہ آئے ہوں وہ اب شائع کر دیں اور اس مہینے کی 25 تاریخ تک اپنے اپنے نام ناول میں شرکت کے لئے بک بھی کرا لیں بکنگ ونڈو 25 فروری رات کے دس بجے تک کھلی رہے گی اور بکنگ کلرک ڈیوٹی پر موجود رہے گا۔اس کے بعد ناول میں کوئی نیا کردار شامل نہیں کیا جا سکے گا۔ہیرو کے نام کے لئے درخواست دے کر شرمندہ نہ کریں ناول میں ناول نگار مرکزی کردار خود ادا کریں گے۔اس طرح سائیڈ ہیرو کی اسامی بھی پر ہو چکی ہے عطاء الحق کو پورے کا پورا اٹھا کر اس میں ڈال دیا گیا ہے۔البتہ ہیروئنوں کی بکثرت ضرورت ہے کیونکہ اس کی ہیرو کو کوئی سابقہ مہارت نہیں ہے۔سنا ہے اس نے اس بات کا اعتراف بھی کر لیا ہے کہ اپنے سفرناموں میں جن خواتین کا

ذکر کیا تھا وہ سارے کے سارے کردار فرضی تھے۔ آئندہ ایڈیشن میں اس کا بالوضاحت ذکر کیا جائے گا۔ ہر سفرنامے کے شروع میں سگریٹ کی ڈبیہ پر درج بھارت کی طرح امتناعی عبارت جلی حروف میں درج کی جائے گی کہ۔

1- اس سفرنامے کے جملہ کردار مقامات اصلی اور جملہ کردار فرضی ہیں۔ اگر کسی محترمہ کو اس میں اپنی جھلک نظر آئے تو یہ مشابہت محض اتفاقی ہوگی۔

2- سفرنامے میں بعض مضر صحت کردار بھی شامل کئے گئے ہیں۔ قارئین سے التماس ہے کہ درگزر فرمائیں۔ سفرنامہ نگار کے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اسے عذاب قدرت سے بچائے اور اس کی عاقبت بخیر ہو۔

3- اٹھارہ سال سے کم عمر کے قارئین سے التماس ہے کہ اس سفرنامے کو نہ پڑھیں ورنہ نقصان کے خود ذمہ دار ہوں گے۔

مقتدرہ قومی زبان کی اردو خدمات

مقتدرہ قومی زبان کی طرف سے حال ہی میں اردو کی سائنسی کتابوں کا اشاریہ شائع ہوا ہے۔ سنا ہے دوسری جلد اس کے اغلاط ناموں پر مشتمل ہوگی۔ جس کی ضخامت پانچ سو صفحات بیان کی جاتی ہے۔

دوستی، دوستی

ڈاکٹر وزیر آغا آئندہ احمد ندیم قاسمی کے خلاف کچھ نہ لکھیں گے نہ لکھوائیں گے۔ ہاں خود بخود سب کچھ ہوتا چلا جائے تو بات دوسری ہے۔

مسٹر دہلوی

مسٹر دھلوی گھریلو، سگھڑ اور صحت مند قسم کے مزاح نگار ہیں۔ اس کے مزاح کا محور گھر کی چار دیواری کے اندر سے شروع ہوتا ہے اور سلیقہ مندی و وفا شعاری کی چار دیواری سے پھلانگتا ہوا ملکی سیاست اور ملکی تعلیم بلکہ ملکی مصنوعات اور خاندانی منصوبہ بندی تک چلا جاتا

ہے۔ یہ زقند خلاباز کی طرح مزاح نگاری کی زمین پر پہلا انسانی قدم بھی ہے۔ دھلوی نہ صرف گھر کے معاملات اور کاروباری مسائل میں ''پالتو شوہر'' اور وفادار اور فرض شناس ماتحت ہیں بلکہ امور اور سیاسیات طبعی میں بھی ان کی وضع داری اور ''سیان پن'' کبھی منہ زور نہیں ہوتا۔ یہ نہیں کہ ان کا ضمیر مردہ ہو چکا ہے یا چشم بد دور وہ عمر کی پچاس منزلیں طے کرنے کے بعد اب اطاعت گزاری کے ذریعے ہی ملازمت میں ریٹائرمنٹ کے مزے لینا چاہتے ہیں بلکہ سچ شاید یہ ہے کہ نظم میں تو اکبر ان کے پیرومرشد ہیں اور اکثر وہی ان کی چونچ دبا لیتے ہیں لیکن نثر میں مرشد نے حق بیعت عطا کر دیا ہے۔ یہاں مرید باصفا نے اپنی پرواز کے لئے جو فضا منتخب کی ہے اس میں ایک خاص طرح کا توازن خود ان کی ذات یا ان کی نجی زندگی سے پیدا ہوا ہے۔ وہ اپنے غصے کو کبھی زہرناک نہیں ہونے دیتے۔ ہوسکتا ہے غصے کو پی جانے کی ''شوہرانہ صفات'' نے انہیں کبھی گھر میں امن و آشتی کی دولت سے بھی مالا مال کیا ہو یا وہ اس سے بوجوہ محروم رکھے گئے ہوں، تاہم ''محتسب رادروں خانہ چہ کار'' اردو کی نثری مزاح نگاری میں انہوں نے اس انداز نظم وضبط کو جس سلیقے سے اپنایا ہے وہ ایک انوکھی چیز ہے۔

مسٹر دھلوی غصّے کو مزاح میں تبدیل کرنے کا گر جانتے ہیں اس لئے ان کی ناراضی جھنجھلاہٹ یا طنز وتعریض پر منتج نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کی مدد سے مزاح کی ایک لطیف سی صورت اختیار کرتے ہیں جس کی حدیں ظرافت کی تندی اور طنز کی کاٹ دونوں سے جدا ہیں۔ فلسفیانہ افکار اور علمی معلومات کو شگفتہ بیانی کے زور سے انہوں نے جس طرح کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ہمارے ہاں ظرافت کی ایک بالکل نئی شکل ہے۔

''سرراہ قلم'' کے اکثر مضامین مسٹر دھلوی کے اس کمال فن کی زندہ مثال ہیں۔ مضمون کی سیاست، جہل علم کا خالق، انہیں ادب یاروں کے ذریعے اردو مزاح نگاری میں اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ ہائے گرانی، وائے گرانی اور کاروبار عقد میں ان کے ''ہنر'' کسی نمایاں جہتوں کا سراغ ملتا ہے جس سے بخوبی اندازہ ہوتا کہ وہ بعض سکّہ بند مزاح نگاروں کے برخلاف دوچار بندھے ٹکے

موضوعات تک اپنے آپ کو محدود کر دینے کے حامی نہیں اور زندگی کے وسیع تر رقبوں کا احاطہ کرنے کے قائل ہیں۔اس رو میں وہ کسی اہم سماجی یا علمی مسئلے کو نظر انداز نہیں کرتے اور فقط اپنے ذخیرہ معلومات کو قاری پر بے ضرورت لادنے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ اپنے علم اور ذہنی توانائی دونوں کو بحال رکھنے میں کامیاب ہیں۔

ان کے ہاں اگر چہ مزاح خفگی ہی کی منقلب صورت سے جنم لیتا ہے لیکن اس کا نتیجہ خوشگوار احساسِ مسرت ہوتا ہے۔یہ احساسِ مسرت نہ زہر خند ہے، نہ طنز ہے، نہ چبھتی ہے، نہ خندہ دنداں نما' نہ خندہ زیرلب بلکہ اس سے بھی کسی قدر بچ بچا کر ظرافت کی کفایت شعاری' کا ایک نیا معیار ہے جس پر اردو ادب کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔

چلتے چلتے ایک بات اور کہنے کی اجازت دیجئے۔مزاح اور سنجیدگی کے بین بین جو پل صراط انہوں نے دریافت کیا ہے وہ کوہ البرز نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے۔ ایرانی دیومالا کا انسان جب اپنے بکرے کو لے کر اس تلوار سے زیادہ باریک دھار والے پل سے گزرتا ہے تو آگے اسے ایک چار چشم' کتا' ملتا ہے۔یہ کتا کڑی آزمائش کی علامت ہے۔مسٹر دھلوی اگر اس کی آواز سے ڈر گئے تو ان کی بھی خیر نہیں اور ان کے بکرے کی بھی نہیں۔''سوءادب'' میں بعض مقامات پر مسٹر دھلوی اور ان کا بکرا دونوں کس قدر گھبرائے ہوئے سے پھرتے ہیں۔خدا خیر کرے اور انہیں نظر بد سے بچائے۔دلّی کے اہلِ زباں کہتے ہیں بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔لیکن میں اہل زبان نہیں بلکہ صرف مسٹر دھلوی اور ان کے بکرے دونوں کا دعا گو ہوں اور پوری توقع رکھتا ہوں کہ جس اعتماد سے انہوں نے ''سپرِ قلم'' میں قدم رکھا تھا اس کو ''سوءادب'' کے بعد بحال کر لیں گے۔ان کی اصل منزل طنز سے دو ہاتھ ادھر ہے بقول غالب ان کے فتنے کو فتنۂ محشر سے دو ہاتھ کم ہونا چاہئے اور اسی میں ان کے فن کی سربلندی اور ان کی ہنرمندی پوشیدہ ہے۔

◆❖⌘

(۷)

مزاحیہ تبصرے

کرنل غلام سرور کی سرگزشت

''آئینہ ایام'' کسی خاتون کی طبی ڈائری نہیں کرنل غلام سرور کی آپ بیتی ہے بلکہ ایک لحاظ سے تو جگ بیتی ہے کیونکہ انہوں نے اپنا ''کچا چٹھا'' ہی بیان نہیں کیا دوسروں کے نفسیاتی تجزیئے بلکہ پوسٹ مارٹم بھی کر دیئے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس عملِ جرّاحی کے بعد ان لاشوں کو انہوں نے سرد خانے میں نہیں پھینکا بلکہ ان کی نہایت اعلیٰ پیمانے پر تجہیز و تکفین بھی کی ہے۔ کفن و دفن ان کا آبائی پیشہ تھا۔ ان کے والد سکول کے استاد تھے' طب بھی ان کا مشغلہ تھا۔ اس لئے ان کا رشتہ کار آمد اور دولت خیز' پیشوں سے نہیں بنتا' بلکہ دولت اور ثروت سے تو بالکل نہیں بنتا۔ نہ جانے کیوں ان میں جرّاح کی احتیاط نظر اور تشخیص کی مہارت فن پائی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی گورکنی کی ایک شان ''تاجِ محلی'' بھی ہے۔ وہ لفظوں کے نرم و ملائم سنگ مرمر سے حسین عمارت کی تعمیر کا سلیقہ رکھتے تھے۔ سختی اور نرمی کا امتزاج آئینہ ایام کے اسلوب کا امتیازی وصف بھی ہے کہ وہ ماہر تعمیرات پتھر و کھردرا موم کی سی نرمی دے کر جمالیاتی احساس کو پیدا کرتا ہے اس طرح ان کا یہ دھیما لیکن کھردرا اسلوب اپنی الگ شان رکھتا ہے۔ کسی کسی کو قاری کو یہ احساس ستانے لگتا ہے کہ ہو نہ ہو ان کے اجداد میں معماری کا کوئی نہ کوئی پیوند ضرور لگا ہے۔ کیونکہ یہ اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے، اس بات کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے اور تھوڑی دیر اِدھر اُدھر بہک کر

واپس اپنی منزل پر آ جاتے ہیں ان میں اچھی نسل کے مویشیوں کی بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں، ایک تو اپنے کھونٹے پر سرِشام واپسی، دوسرے اونچے اونچے درختوں یعنی قدآور شیخیوں کے ساتھ تھوڑی تھوڑی چھیڑ خانی یعنی منہ مار آگے نکل جانے کی عادت' تیسرے اپنی برادری یعنی ادیبوں کی نسل کے ہر جانور سے پیار اور چلتے چلتے زبان لطف سے اسے چاٹنے اور اس پر محبت نچھاور کرنے کی عادت چوتھے اپنے سے بزرگ نسل خصوصاً استاد کی نسل سے والہانہ عشق۔ عشق بہرحال اندھا ہوتا ہے اس لئے اس میں کھرے کھوٹے کے فرق کو وہ زیادہ روا نہیں رکھتے۔ لیکن یہ ڈنڈی مار مروت انہوں نے صرف اپنے استادوں تک محدود کر دی ہے۔ دوسروں کو وہ معاف نہیں کرتے۔ ان کی نرم گفتاری دوسروں کے ماضی کا حال بیان کرنے میں خاصی بے باک بلکہ بے رحم بھی ہے اور یہیں ان کے کمالِ فن کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا یہ دیہاتی پن ایک یملے جاٹ کی یاد دلاتا ہے جو ہمیشہ بکارِ خویش ہوشیار ہوتا ہے۔ پانچویں صفت یہی بکارِ خویش والی ہے، یہاں بھی وہ ترے جاٹ نکلے ہیں، یعنی اپنی ذات کی سنگار میز سجانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ خواہ مخواہ بقراط بننے کی کوشش نہیں کرتے۔ کھردرے اور دھیمے لہجے کی بنت سے انہوں نے صاف گوئی کا نیا طرز وضع کیا ہے۔ حلقہ یاراں میں ان کی نرم مزاجی اور خلوص کو پسند کیا گیا اور بزمِ اغیار میں بھی اس کا صلح پسندی اور نرم گفتاری مقبول و محمود رہی ہے۔ ہمارے معاشرے میں اگر سچ اور کھرے آدمی کو دشمن بھی برداشت کر لیں تو سمجھ یہ شخص بڑا خوش نصیب ہے۔ اور کسی نہ کسی دن ضرور اس کے دن پھریں گے۔ اور وہ کسی نہ کسی بڑے عہدے پر قابض ہو جائے گا، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان میں بڑا آدمی بننے کے سارے لچھن موجود ہیں ایسا آدمی دوستوں سے مار کھا جائے تو اجتماعی کھا جائے، دشمنوں سے کبھی مار نہیں کھاتا۔ اس کی نرم گفتار وہ دفاعی ہتھیار ہے جس کا استعمال کسی اجتماعی ضابطۂ تخفیف اسلحہ کی زد میں نہیں آتا۔ کرنل غلام سرور پیدائشی طور پر استاد اور پیشے کے اعتبار سے ایک فوجی ہیں، اعلیٰ نسل کے فوجی اور اعلیٰ نسل کے ادیب جس خطۂ جنت نشان سے آتے ہیں اسے جہلم کی وادی کہا جاتا ہے۔ اسی میں مزاح نگاروں کی وہ ''پیوندی نسل'' بھی ہے جس میں فوج اور ادب

کا حسین امتزاج ملتا ہے، جفاکشی، ریاضت، نظم وضبط کے ساتھ ساتھ حسِ مزاح کی موجودگی، اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اور اس اعتبار سے کرنل غلام سرور کے ہاں بھی ایک پورا نعمت خانہ موجود ہے۔ میں جہلمی مزاح نگاروں کے مزاح کی چشتی کو اس وادی شاداب کا ثمر قرار دیتا ہوں لیکن میرے ایک دوست اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ مزاح کا تعلّق جہلم سے نہیں ''بیگم'' سے ہوتا ہے ''اردو ادب پر بیگمات کے احسانات'' کے موضوع پر ابھی کوئی تحقیقی مقالہ نہیں لکھا گیا اس لئے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فی الحال حتمی طور پر صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ کرنل محمد خاں، میجر ضمیر جعفری اور دوسرے جہلمی پیوندی مزاح نگاروں کی مزاح نگاری کے محرکات میں بیویوں کے حقوق کا مسئلہ کبھی نہ کبھی آتا ضرور ہے۔ ہمارے یہ مزاح نگار اگر بیویوں کے بارے میں لب کشائی کی جرأت کر سکیں تو یہ محرکات بہ آسانی معلوم ہو سکتے ہیں۔ فی الحال تو ہم ان نیک بیبیوں کو سلام بھیجتے ہیں جن کی بدولت اردو مزاح نگاری کا بھرم قائم ہے، ہر اچھا مسلمان دوسرے مسلمان کے کام آتا ہے اور ان نیک بیگمات نے اپنے شوہروں پر صبر کر کے ادب پر جو احسان کیا ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس احسان کا بدلہ کوئی حکومت ''خواتین ایوارڈ'' دے کر اتار کر سکتی ہے، نیک مسلمانوں کے دلوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے، اور گھروں کا حال ہمسایوں کو معلوم ہوتا ہے۔ کرنل غلام سرور اگر اپنے اور اپنے ادیب دوستوں کے گھریلو حالات پر روشنی ڈال سکیں تو یہ اردو ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ ان ہی میں ''شوہرانہ وفاداری'' کا وہ جوہرِ خاص موجود ہے جس میں ہر اچھا سپاہی میدانِ جنگ میں برق آہن بن جاتا ہے۔ اور بزم میں (یعنی گھر کے اندر) حریر و پنہاں ہوتا ہے۔

قعر دریا سلسبیل موجِ دریا آتش است کے مصداق جہلمی ادباء کی نجی زندگیاں ادب کو ملائمت اور مزاح کو حسن بیان کی جو نعمت دے دی گئی ہے اس پر ادب جتنا بھی فخر و ناز کر لے بجا ہے۔ باقی ہے ہمارے کرنل غلام سرور تو جہاں انہوں نے ''آئینہ ایام'' میں اپنے بارے میں اتنا ڈھیروں سچ بولا ہے، اگر تھوڑا سا سچ دوسروں کے بارے میں بھی بول دیں تو بہت سی غلط

فہمیاں دور ہوسکتی ہیں۔

ہم بھی اردو مزاح کے بارے میں کس قدر ''جہلم پسند'' واقع ہوئے ہیں۔اگر چہ ہمارا یا ہماری بیوی کا جہلم سے مطلق کوئی تعلق نہیں، پھر بھی ہم سمجھتے ہیں کہ اردو ادب میں مزاح نگاری کا دور جدید ایک لحاظ سے جہلم کے ادب دور جدید ہے۔ادب کی جملہ ترقیاتی سکیموں میں جہلم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔وزارت سازی سے لے کر ادب سازی تک جملہ گھریلو صفتیں جہلم ہی میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

ہمیں آغاز جوانی کا تھوڑا سا زمانہ جہلم میں بسر کرنے کا موقع ملا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب ضمیر جعفری نے جنگی نظموں کا مجموعہ ''کارزار'' شائع کیا تھا اور اس کے سہارے فوج میں بھرتی ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ان میں اور مزاح نگاری میں ابھی کئی منزلوں کا فاصلہ تھا یا دوسرے لفظوں میں ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔اور وہ مزاح کے کھکھیڑ میں نہیں پڑے تھے۔اس زمانے میں ایک شاعر نرالا تخلّص محفلوں کی جان ہوا کرتا تھا۔وہ اپنے سر پر کاغذ کی اونچی دیوار کی ٹوپی سجاتا تھا جس پر کئی رنگ ہوتے تھے۔وہ اپنے مضحک لباس اور بے وزن اشعار سے شاعروں کو گرماتا تھا اور لوگ اس مزاح پر جان دیتے تھے۔اصل میں اپنے آپ پر دوسروں کو ہنسا کر خوش ہونے کی روایت جہلم سے خاص تھی۔اور خاص چلی آتی ہے۔نرالا کی دیوانگی میں کسی عورت کا ہاتھ تھا یا نہیں، اس کی اطلاع نہیں تھی۔لیکن اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کہ مزاح کی قدردانی کا ایک خاص سلیقہ سرزمین جہلم کو حاصل ہے۔جو نرالا کی دیوانگی سے لیکر کرنل غلام سرور کے ''یملے پن'' تک کو برداشت ہی نہیں کرتی، اس کی قدردانی بھی کرتی ہے اور یہ مال دساور کو بھی بھیجتی رہتی ہے، آج کل اس طرح کے مال کی سب سے بڑی منڈی اسلام آباد ہے جہاں اکیڈمی آف لیٹرز بھی سال میں ایک بار ادب کا میلہ مویشیاں منعقد کرتی ہے اور عمدہ ''پہارو'' غیر ممالک کو نمائش کے لئے روانہ کرتی رہتی ہے۔ادبائے جہلم کو قدرت کی طرف سے سلیقہ خاص حاصل ہے کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں خوب پھلتے پھولتے ہیں۔کرنل غلام سرور کرنل کو

ہم نے ''پھلتے'' اور میجر ضمیر جعفری کو ''پھولتے'' اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

کرنل غلام سرور کی ادبی زرخیزی کا سبب ان کا قیام راولپنڈی ہے۔کسی دوسرے شہر میں ہوتے تو اتنے بارآور بھی نہ ہوتے اور قدآور بھی نہ ہو سکتے کیونکہ ان کے علم وفضل اور روانی قلم کے لئے آس پاس کی سرسبزی ضروری ہے۔آس پاس اچھا ہو تو ان کا قلم بھی برق رفتاری سے چلتا ہے۔ڈیفنس لاہور ہی میں بیٹھ کر وہ انتظامی امور ہی نہیں نپٹاتے ،ادبی امور بھی بہ سرعت ٹھکانے لگاتے رہتے ہیں۔کتابیں اور ادیب ان کی مرغوب غذا ہیں۔یہ غذا ان کی تندرستی کے لئے بہت ضروری ہے اگر کسی دور کے شہر میں ہوتے، جہاں دونوں لذتیں میسر نہ ہوتیں تو ان کی تخلیقی صلاحیتوں یا ضعف آ جاتا۔ایسے خوش نصیب درخت کم ہوتے ہیں جو بہت فاصلے اپنی غذا کشید کر کے سدا بہار رہتے ہیں۔لے دے کر ہمارے اشفاق احمد ہیں جن کا قیام لاہور میں اور جڑیں اسلام آباد میں ہیں۔وہ تن آور درخت بن گئے ہیں اور ان کی ادبی کارکردگی آس پاس کی پرورش و پرداخت کی محتاج نہیں رہی۔غلام سرور کی زندگی نمود ونمائش سے خالی ہے۔یہ جہدِ مسلسل کی زندگی ہے انہوں نے اپنی قوت بازو سے اپنا مستقبل بنایا ہے اور اپنے ہی تیشے سے جوے شیر نکالی ہے جوش کی طرح انہوں نے زندگی کی محرومیوں کا انتقام نہ اپنے آپ سے لیا نہ معاشرے سے لیا ہے بلکہ ''آئینہ ایام'' میں کو آپ کو سترہ عشقیہ داستانوں کی طرز کا کوئی ایک معرکہ بھی نہیں ملے گا۔وہ شاید اس میدان کے مرد ہی نہیں۔اخلاقی قدر میں کسی ہوئی جیکٹ بن کر اگر انسانی روح کو پامال کرنے لگیں تو اس نے عشق کی اصلی اور فرضی داستانیں وجود میں آئی ہیں لیکن اگر انسان کرنل غلام سرور کی طرح مطمئن جنسی زندگی بسر کرار ہا ہو۔تو اخلاقی ضابطے روحانی غذا کا کام دیتے ہیں۔غلام سرور کے ہاں حرارت ایمانی اور اطمینان قلب کی دولت کا ذخیرہ وافر موجود ہے۔اس لئے احسان دانش کی طرح ان کی زندگی دوسروں کے لئے ایک سبق ہی ہے اور جدوجہد کا پیغام بھی۔

ان کے ہاں مبلغین کا جوش وخروش نہیں، دھیما پن ہے استدلال میں مزاح کی ہلکی ہلکی آمیزش رکھتے ہیں۔وہ اس گر سے واقف ہیں کہ امر واقع اور کیفیت کے درمیان فرق ہے اور

حقیقت نگاری تخیل کے عنصر سے خالی نہیں ہوتی۔اس لئے بعض نقادوں کی رائے یہ ہے کہ اچھے ادب کے لئے تھوڑا سا جھوٹ بھی ضروری ہے' کرنل غلام سرور واقعات کے بیان میں با تخیل کی آمیزش کو شامل رکھتے ہیں اور یہ ان کے کمالِ فن کا ثبوت ہے۔کتاب کا آغاز انہوں نے اسی طرح کی افسانہ طرازی سے کیا ہے۔بڑے آدمیوں کی پیدائش پر بشارتوں کا ظہور عموماً دیکھنے میں آیا ہے' کرنل سرور کو بڑائی کا دعویٰ تو نہیں لیکن ان کی پیدائش کے سلسلے میں مستقبل کی جھلک نظر آتی ہے۔

> اللہ بخشے خالہ جان ایک خواب کا ذکر مزے لے لے کر کرتی تھیں۔ یہ خواب ایں جانب سے متعلق ہے، آپ بھی سن لیجئے۔خالہ جان خواب میں کیا دیکھتی ہیں کہ ایک باریش بزرگ سراپا سبز لباس میں ملبوس' ہاتھوں میں کشکول لئے ہمارے گھر وارد ہوتے ہیں اور بہ آواز بلند آپا جان سے راہ خدا حسب توفیق نذر طلب کرتے ہیں۔ادھر والد صاحب کسی گہری سوچ میں غلطاں ہیں۔انہیں درویش کی آمد کا علم ہی نہیں ہو پاتا۔مگر جب درویش کی آواز میں شدت اور خفگی ابھرنے لگتی ہے تو وہ چونک پڑتے ہیں اور حسب توفیق درویش کو نذرانہ پیش کرنے کے بعد پھر گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔سائیں بابا والد صاحب کی پریشانی کا سبب پوچھتے ہیں۔ابو بہت لیت ولعل سے کام لیتے ہیں۔مگر بزرگ کا اصرار غالب آ جاتا۔ناچار والد صاحب اپنی داستان غم یوں بیان کرتے ہیں۔''اے اللہ کے نیک بندے تو نے میرے دل کے زخمی تاروں کو چھیڑ ہی دیا ہے تو سن' مجھے اللہ نے دو بیٹے عطا کئے تھے ایک تین سال کی عمر کو پہنچ کر مجھے داغ مفارقت دے گیا دوسرا بچہ بن کھلے مرجھا گیا پیدائش کی چند ساعتوں کے بعد ہی اس نے آنکھیں موند لیں۔اب میرے لئے دنیا اندھیر ہے بیٹوں

کی جدائی مجھے نڈھال کئے ہوئے ہے''۔ مرد درویش بڑے غور اور توجہ سے یہ باتیں سنتے ہیں پھر معاً ان کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھتے ہی تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ یوں گویا ہوتے ہیں۔ بھائی فکر مت کر۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک کے صدقے اور نیک بندوں کی دعاؤں کے طفیل تمہیں ایک بیٹا عطا کرے گا۔ جو بڑے نصیبوں والا ہوگا۔ وہ بڑا نیک اور سعادت مند ثابت ہوگا۔ اور تیرے خاندان کو چار چاند لگائے لگا۔ جا اٹھ نماز پڑھ، اللہ کی راہ میں خیرات دے، تیرے نصیب جاگ اٹھے ہیں''۔

والد صاحب نے یہ باتیں سنی تو ان کے دل کی مرجھائی ہوئی کلی کھل اٹھی۔ طبیعت شاداب ہوگئی، دل میں آیا سائیں بابا کی کچھ خدمت کی جائے، آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو غائب تھے اور بزرگ کی بشارت کے مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کی رات میرے والدین کے ہاں ایک چاند کا ٹکڑا تشریف فرما ہوا''

کرنل صاحب کی خالہ جان نے بیج بولا تھا یا نہیں' مجھے اس سے سروکار نہیں، اس میں بنیادی صداقت تو یہی ہے کہ دیہات کے اس ہونہار لڑکے نے شہر میں آ کر سبزی ترکاری بھی فروخت کی۔ اپنی محنت سے اپنی دنیا تخلیق کی اور جدوجہد اور عمل پیہم سے اس درجے تک پہنچا جس پر آج بھی اس کے گاؤں والے فخر کر سکتے ہیں۔ سعادت مند بیٹے کی سعادت مندی اس سے زیادہ کیا ہوتی کہ اس نے اپنے ماضی کو فراموش نہیں کیا۔ اور اپنے دوستوں سے چھپایا بھی نہیں۔ اسے اپنی غربت پر ناز ہے اور اپنی ترقی کو اللہ کے فضل و کرم کا ایک ادنیٰ کرشمہ جانتا ہے۔ اس کی حوصلہ مندی کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہوگا کہ بڑے بڑے طوفانوں میں اس نے اپنے اعصاب کو برقرار رکھا اور منفی قوتوں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ صاف گوئی کا یہ عالم ہے کہ مار بھی کھاتا ہے پھر بھی سچ سے باز نہیں آتا۔ لیکن اگر کسی کمزور ایمان کے آدمی کے بیٹے کو سچ بولتے دیکھتا ہے تو اسے اپنا

حریف جان کر معاف بھی نہیں کرتا:

''بات ہیڈ ماسٹر رؤف ہاشمی صاحب کی تھی، ہاشمی صاحب باتوں کے بڑے دھنی تھے بولتے تو محفل پر ان کی گھن گرج کا سکتہ بیٹھ جاتا۔ اکثر اوقات صبح کی اسمبلی سے خطاب فرماتے۔ مجھے اس ضمن میں رمضان شریف کی ایک صبح کبھی نہیں بھولے گی، میں اپنے گھر سے نکل کر سکول آ رہا تھا کہ راستے میں ان کے صاحب زادے سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں نے پوچھا ''ابو کیا کر رہے ہیں''، مصلحت کے تقاضوں سے بے نیاز معصوم بچہ بولا ''سر وہ ناشتہ کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر وہ سکول آنے ہی والے ہیں'' اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہاشمی صاحب کی تقریر دلپذیر یوں شروع ہوتی ہے پیارے بچو !اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر روزے فرض کئے ہیں جس طرح پہلی امتوں پر فرض کئے گئے تھے۔ یہ اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ یاد رکھو روزے کا تارک جہنمی ہے۔ قیامت کے روز اسے سخت ترین عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا''۔ ہاشمی صاحب کے ارشادات جاری تھے ادھر میرے کانوں میں ان کے بیٹے کی صدا گونج رہی تھی۔ ''ابو ناشتہ کر رہے ہیں''۔

ابو کا ناشتہ کرنل صاحب کے مطالعۂ انسان کا مرکزی نقطہ ہے۔ انہوں نے آئندہ ایام میں اس طرح کی شخصیتوں کا خوب خوب نقشہ درج کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر انسانی نفسیات کی تصویر کشی کے ماہر ہیں۔ کتاب کا یہ جگ بیتی والا پہلو بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے تصویر کشی میں رعایت برتی ہے تو صرف اپنے ماں باپ کے بارے میں۔ ماں باپ، بہن بھائی احتساب سے خارج ہیں۔ اور دوسرے لوگ ابو کا ناشتہ ہیں۔ ان پر بے دریغ ہاتھ کو صاف کیا جا سکتا ہے۔

بزرگوں میں عیب نکالنا، سعادت مند بیٹوں کو زیب نہیں دیتا' ہاں استادوں پر اگر ایک آدھ ہاتھ الٹا بھی پڑ جائے تو کچھ حرج نہیں' یہاں صاف گوئی زیب دیتی ہے اور بیچ کھیت زیتی دیتی؟ زیب ہے اسے جس قدر اچھا کہتے غالب نے یہ بات چکنی ڈلی کے بارے کہی تھی۔ کرنل صاحب نے اسے استادوں پر ڈال دیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرؤف بی ایڈ کے زمانے میں ان کے استاد تھے۔ ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''موصوف کتابی بات ذرا کم ہی کرتے۔ اپنے تجربات زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتے۔ تجربات سناتے وقت لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہ تھے۔ گاہے گاہے پاسبان دل کو تنہا چھوڑ دیتے۔

جملوں کی بلاغت کا مزہ وہی جانتے ہیں جنہوں نے ڈاکٹر رؤف کو دیکھا ہے یا ان کے ملفوظات سنے ہیں۔ کرنل صاحب استادوں کے سامنے کسی قدر محتاط ہیں لیکن دوستوں کے سلسلے میں زیادہ ''ہتھ چھٹ'' واقع ہوئے ہیں۔ بریگیڈیئر اعجاز کے بارے میں ان کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

''اعجاز صاحب کے مزاج میں بڑی بے قراری پائی جاتی ہے، جو کام سکون اور حوصلے سے کیا جا سکتا ہے اس میں بھی یہ اضطراری صورت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بڑے صاحب کی طرف سے بلاوا آ جائے تو یہ ان کی خدمت میں چل کر حاضری دینے کے قائل نہیں، بھاگ کر آداب بجا لانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ صاحب کی کسی بات سے اتفاق کرنا منظور ہو (اور وہ سو فیصد معاملوں میں ہوتا ہے) تو ان کے بدن کا ہر عضو سراپا داد بن کر ابھرتا ہے ان کے ''مہربانوں'' کو ان اداؤں سے خوشامد کی بو آتی ہے۔ ویسے حق یہ ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس طرح کی دلچسپ

ادائیں تو ان کی شخصیت کا حصّہ ہیں۔ اعجاز صاحب کے مزاج کا ایک خاصہ یہ ہے کہ وہ کام کرنے کے بعد اس کی تشہیر کا پورا پورا انتظام بھی کرتے ہیں۔ اسی طرز عمل میں ذاتی نام ونمود کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ ان کی اصل خواہش یہ ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی ان کی کارکردگی اور ان کی محنت اور ان کے جذبے کی لگن کے قائل ہوسکیں۔ افسوس ان کی یہ ادا بھی ہمارے کئی ساتھیوں کو نہیں بھائی''۔

آپ بیتی کا مرکزی زاویہ یہی کرداری کا مطالعہ ہے۔ پوری داستان میں جو شخصیتیں ہیں ان میں ہر ایک کی ایک مخصوص وضع ہے' ہر شخصیت کے دو چار نمایاں پہلو لے کر انہیں اپنے ''نیم سنجیدہ'' پیرائے میں بیان کرتے جاتے ہیں، جس سے زندگی کی رنگا رنگی کا احساس بھی ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ آپ بیتی لکھتے ہوئے صرف اپنے آپ کو مرکز کائنات ظاہر کرنے کی فکر میں نہیں بلکہ آس پاس کی وسیع کائنات میں ان کی دلچسپیاں' معمولی واقعات میں نہاں حقائق کے بارے میں فلسفیانہ روّیہ زندگی سے گہری دلچسپی کے ساتھ ساتھ مذہبی اقدار کی بالادستی کا احساس' زندگی کو اپنے لئے قابل قبول بنانے کی مسلسل سعی اور دوسروں کے لئے قربانیاں دینے کا شعور، ان کی ذات کے وہ داخلی تار و پود ہیں جن سے انہوں نے اس آپ بیتی کی دنیا سجائی ہے۔ وہ اپنی آپ بیتی میں اس بیل کی صورت دکھائی نہیں دیتے جس کے سینگوں پر ساری کائنات کھڑی ہے' وہ تو اپنے آپ کو اس وسیع کائنات میں ایک فرد کے طور پر دیکھتے ہیں جو سارے زمانے کی خوشیاں سمیٹ کر دوسروں کے حوالے کرتا ہے اور اپنے غم اکیلے برداشت کرنے کی کوشش میں مبتلا ہے وہ اپنی خامیوں سے بھی آشنا ہے اور انہیں چھپانے یا ان کی تاویل کرنے کی کوشش نہیں کرتا وہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز ہی سے صرف فراز ہی سامنے نہیں لاتا نشیب کی باتیں بھی کرتا ہے۔ اپنے مذہبی اور سیاسی عقائد کے بارے میں جو تبدیلیاں اس کے ہاں آتی ہیں، ان کی روداد

بڑی دلچسپ ہے۔اس دیہاتی نے جب پنڈی کے ڈی اے وی کالج میں داخلہ لیا تو اسے خالہ جان ہی نہیں بعض مارکسی بچوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔اس کی روداد انہی کی زبانی سنیئے ۔

آپ کو ہسٹری کے کلاس روم میں لے چلتا ہوں، جہاں پروفیسر (شرما) صاحب اپنے طلباء کو کلاس ٹیسٹ کے نتائج سے آگاہ کر رہے ہیں، لیجئے میرا نام پکارا جاتا ہے۔اللہ خیر۔ جانے پٹاری کھلنے پر کیا چیز برآمد ہوتی ہے۔ مابدولت تو پوری کلاس میں اول آ گئے' کوئی فلوک (Fluke) لگ گیا ہوگا' پروفیسر شرما مجھے انتہائی غور سے دیکھتے ہیں۔سراپے کا جائزہ لیتے ہیں اور میرے پچکے ہوئے گالوں، زرد چہرے اور اندر دھنستی ہوئی آنکھوں سے اندازہ لگاتے ہیں کہ فرسٹ آنے والا یہ لڑکا ضرور افلاس اور بدحالی کا شکار ہوگا۔البتہ جذبہ ترحم ابھرتا ہے جس کے نتیجے میں ہم ان کی خصوصی توّجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔معروف فنڈ سے وظیفہ دلوانے کے ساتھ ساتھ میری ذہنی نشوونما پر بھی خصوصی توجہ دینے لگتے ہیں اور جب میرے مالی حالات کا صحیح صحیح علم ہوتا ہے تو وہ مجھے شہر میں واقع ایک لائبریری میں لے جاتے ہیں۔ پانچ دس روپے کا زرضمانت اپنی جیب خاص سے ادا کرتے ہیں اور ماہانہ چندہ کی رقم ایک سال کی یکمشت دے کر ہمیں اس لائبریری کا باضابطہ رکن بنوا ڈالتے ہیں۔ بہت جلد ہی راز کھلتا ہے کہ پروفیسر شرما کیمونسٹ پارٹی کے رکن ہیں اور جس لائبریری کا مجھے رکن بنایا گیا ہے وہ مقامی کیمونسٹ پارٹی کے زیراہتمام چلتی ہے.....کبھی باقاعدگی کے ساتھ لائبریری کا چکر لگایا کرتا تھا، وہاں ایک عمر رسیدہ انسان سے میری مڈبھیڑ ہوا کرتی جسے اس کے حلقہ بگوش دادا

کہہ کر پکارتے۔ یہ ''دادا'' بڑا گرگ باراں دیدہ تھا، ہر آنے جانے والے سے فوراً گھل مل جاتا اور کسان مزدور کا غم بڑی دلسوزی اور غم گساری سے کھایا کرتا۔ مجھے بھی اکثر اپنی محفل میں شریک کر لیتا۔ بات کسان مزدور سے نکل کر ہیگل، مارکس اور لینن کے اردگرد گھومنے لگتی' یہ عمل بڑی تیزی سے دوہرایا جاتا..... دادا جان اپنے پوتے یعنی اسی خاکسار پر خصوصی توجہ فرمایا کرتے۔ کیمونسٹ' خام مال پا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اس مال کو وہ مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ دادا جان اکثر کہا کرتے'' کامریڈ! کسان مزدور کو اب زیادہ دیر محکوم نہیں رکھا جا سکتا''۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ ڈھیر سارے بھاری بھر کم الفاظ استعمال میں لاتے بورژوا' پرولتاری' (مادی جدلیت Dialectical Matertelirsm) اور اس طرح کے اور کئی بوجھل الفاظ میں سمجھے بغیر ہی اثبات میں سر ہلا دینا۔ وہ سمجھتے شکار تیزی سے زیر دام آ رہا ہے لیکچر ختم ہوتا تو چائے سے جس کے اوپر بالائی کی گہری تہیں جمی ہوتیں اور دیگر حاضرین مجلس کی تواضع کرتے۔ ہم سمجھتے سر ہلانے کے عوض اگر دودھ ملائی مل جائے تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ لوگ تو روٹی کپڑے کے جھانسے میں اپنا ایمان تک داؤ پر لگا ڈالتے ہیں۔

جون ۱۹۴۷ء میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گاؤں چلا آیا تھا۔ اس دوران پاکستان خدا کے فضل سے وجود میں آ گیا۔ میں اگست میں گاؤں سے لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ ڈی اے ای کالج ویرانے کا منظر پیش کر رہا ہے..... میں سخت پریشان تھا میں نے پروفیسر شرما کی وساطت سے دونئ

کتابیں دادا لائبریری سے مستعار لے رکھی تھیں۔ ایک دن میں انہیں لوٹانے لائبریری چلا گیا دیکھا تو وہاں دادا غائب' اس کی کرسی پر ایک اور نوجوان براجمان ہے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اپنا حال دل نوجوان کو کہہ سنایا اور وہ میری باتیں بڑے غور سے سنتا رہا.....آخر میں (نوجوان) یوں گونجا، ''لاؤ برخوردار! میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ تم تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہو۔ تسلی رکھو تمہیں یہ موقع ضرور فراہم کروں گا۔ تم کل صبح 10 بجے گارڈن کالج پہنچ جاؤ اور وہاں آ کر پروفیسر خواجہ مسعود کا پتہ کر لینا' میں آج ان سے تمہارے بارے میں ذکر کروں گا''۔ شدت جذبات سے ہی کچھ یوں مغلوب ہوا کہ اپنے محسن کا نام پوچھنا بھول گیا۔ ٹھیک دس بجے میں کالج کے احاطے میں داخل ہو چکا تھا۔ چپڑاسی مجھے خواجہ مسعود کے کمرے میں لے گیا۔ ادھر داخل ہوتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ وہی صاحب جو کل دادا کی لائبریری میں میری ڈھارس بندھا رہے تھے وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیئے کہا.....خواجہ صاحب کی کرم گستری سے میرے داخلے کا مرحلہ بڑی آسانی سے حل ہوسٹل میں بھی سیٹ مل گئی۔ درسی کتابوں کا بنڈل بھی بلا معاوضہ مجھے فراہم کر دیا گیا اور سب کام چند گھنٹوں کے اندر اندر مکمل ہو گیا۔

کرنل غلام سرور مسلم لیگی خیالات' احراری عقائد' مارکسی تصورات' پرویزی رجحانات اور جماعت اسلامی کے سیاسی و دینی مسلک کے بارے میں بہت کھل کر باتیں کہتے ہیں۔ یہیں سے ان کے اور ان کے دوستوں کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے' عالی رضوی' انور راجہ اور بعض دوسرے ساتھی اپنی اپنی راہوں پر نکل گئے۔ غلام سرور کے عقائد زندگی کے نشیب و فراز سے گزر کر

درویشی کی منزل تک جا پہنچے۔ اردو ادب کا یہ مرد درویش نئے تجربات سے دوچار رہا، واقعات کی بھٹی سے نکل کر انسان یا تو مومن ہو جاتا ہے یا پھر شیطان۔ کرنل غلام سرور کے لئے کوئی درمیانی راہ اختیار کرنی مشکل ہی نہیں ممکن بھی نہ تھی' کرنل غلام سرور مومن بنے یا ابلیس.....ان سے پوچھا جائے تو وہ از راہ انکسار یا از راہ راست گوئی یہی کہیں گے کہ میں تو گنہگار انسان ہوں، مجھ میں اتنی بلندی کہاں! راقم الحروف جوانی کی صاف گوئی کا قائل ہے، وہ تو فوراً اس راست بازی پر ایمان لے آئے گا لیکن دنیا کسی کے سچ کو سچ کب مانتی ہے؟ وہ تو انہیں مومن بنا کے چھوڑے گی اور پھر ان کی پیدائش پر خالہ جان نے بشارت بھی تو دی تھی۔ کتاب کا خالق اپنے پڑھنے والوں سے گواہی مانگتا ہے۔ کوئی ہے جو سلطانی گواہ بن کر ان کی عظمت کی گواہی دے سکے؟

◆❖⌘

مختار زمن کی ''دیگر احوال یہ کہ''

ایک زمانہ تھا اردو ادب میں دو زمانوں کا چلن تھا۔ایک مردانہ اور ایک زنانہ۔ یہ تو ادب کی دنیا تھی ورنہ اس زمانے میں گھروں کے اندر تو صرف ایک ہی زبان چلتی تھی اور دوسری کے چلنے کی کبھی نوبت ہی نہ آتی تھی۔زبان خاموش اس کا بدلہ یوں چکاتی تھی کہ سید انشا اور جان صاحب ریختی لکھ کر دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے اور سید حیدر حسن پوپلے منہ سے زنانہ گفتگو فرماتے تھے اور اسے بیگماتی نثر کہتے تھے۔چنانچہ اس زمانے کے اردو گرد ڈکشنری بورڈ کے ذمے بھی لغت مرتّب کرنے کا فرض عائد ہوا۔سید احمد دھلوی نے لغات النساء کی داغ بیل ڈال دی۔خوش قسمت تھے کہ پوری کوشش کے باوجود یہ منصوبہ ادھورا نہ چھوڑ سکے۔اور اسے اپنی زندگی ہی میں پورا کر کے ایک غلط روایت کی داغ بیل ڈال گئے۔انہیں اس لغت کو تیار کرنے میں کتنی ہی حسیناؤں کے ناز اٹھانے پڑے ہوں گے۔اس کا حال نہ کھلا کیوں کہ ایسے کام پردے ہی میں ہوا کرتے ہیں۔آج کل کے زمانے میں مختار زمن کا دم غنیمت ہے کہ ان کی تحریوں میں عورتوں کی گفتگو کی کچھ جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ان کے دم قدم سے زنانہ مفادات کا کس قدر تحفظ ہو گیا ہے اس کے لئے اپوا کو ان کا خاص طور پر ممنون ہونا چاہئے۔حق یہ ہے کہ ان کی بیگماتی اردو کئی

مردانہ ڈکشنریوں پر بھاری ہے۔

مختار زمن کو زنانہ زبان کا یہ چسکا کیوں ہے؟ اس کے بارے میں ایک سے زیادہ روایتیں موجود ہیں۔ایک دوست کا خیال ہے کہ قدرت سے کوئی بھول چوک ضرور ہوگئی ہوگی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مختار زمن کی مردانہ گفتگو میں کہیں کہیں زنانہ پیوند لگ گیا ہے۔لیکن ہماری رائے ذرا مختلف ہے۔ہمارا خیال ہے کہ مختار زمن بچپن میں اداکاری کرتے رہے ہیں، اسی اداکاری نے انہیں مرزا ظفرالحسن کی طرح زنانہ کرداروں کے ادا کرنے کا سلیقہ عطا کیا۔وہ مکالمہ نگار ہیں۔انہوں نے اپنی کتاب میں علامہ اقبال اور علی بخش کا مکالمہ بھی لکھا ہے اور آدم وحوا کا ڈائیلاگ بھی بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔

ذرا تصور فرمائیے یہ جنت ہے' دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں' مگر کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھنے والا نہیں' پھول کھلے ہیں' پات ہرے ہیں' مگر یہ کہنے والا بھی کوئی نہیں' کہ چلتے ہو تو چمن کو چلئے.....خاموشی طاری ہے صرف ایک ہلکی سی بھنبناہٹ اس خاموشی کو توڑ رہی ہے' اور وہ ہے فرشتوں کی تسبیح وتقدیس.....ہمارے لکڑدادا جناب آدم باؤلائے ہوئے پھر رہے ہیں۔کوئی ایسا نہیں ملتا کہ دو گھڑی ہنس بول لیں۔باری تعالیٰ کو ان پر رحم آتا ہے۔اور ماما حوا معرض وجود میں آجاتی ہیں.....لیجئے چہلیں شروع ہوگئیں' انکھ مچولیاں کھیلی جاری ہیں.....کدکڑے لگ رہے ہیں' قہقہے لگائے جارہے ہیں..... اور بھئی کھیل کھیل میں تو تو میں میں تو ہوتی ہی رہتی ہے.....ایک موقع ایسا آتا ہے کہ جناب آدم کہتے ہیں۔

''لو بی حوا۔اس دفعہ تم چور ہوگئیں۔''

حوا چمک کر جواب دیتی ہیں ''اے واہ جی واہ! ہوش کے ناخن لو۔میں کیسے چور ہوگئی۔بڑے آئے چور بنانے والے''

آدم جواب دیتے ہیں' اس کی نہیں بدی۔ہار گئیں تو لگیں بسورنے۔تم سولہ آنے چور۔لاؤ ہماری باری دو''

ماما حوا کا چہرہ لال بھبھوکا ہو جاتا ہے۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں اور خفا ہو کر کہتی ہیں ''تم گھپلا کر رہے ہو۔ جاؤ ہم نہیں کھیلتے''۔

ادھر حوا اٹوٹتی کھٹوانٹی لے کر جنتی پھولوں کی نازک سی پلنگڑی پر پڑ جاتی ہیں' ادھر فرشتے باری تعالیٰ کے حضور میں شکایت کرتے ہیں کہ یارب! یہ آدم وحوا بہت چیختے چلاتے رہتے ہیں' ہماری عبادت میں خلل پڑتا ہے۔ کسی دن بات بڑھی تو خواہ مخواہ جھگڑا پیدا ہوگا۔ مانا کہ ہم فرشتے ہیں لیکن ہماری نماز و تسبیح میں خلل پڑا تو کیا ہوگا؟

حوا نے جو یہ باتیں سنی ہوں گی' تو حوا کی بیٹیاں بتائیں، ان پر کیا گزری ہو گی؟ آج آپ اپنے گھر میں کیرم یا بیڈمنٹن کھیلیں اور کھیل کھیل میں ہار جائیں اور کھیل کھیل میں ذرا کوئی ایسی ویسی بات پارٹنر سے ہو جائے..... پڑوس کا کوئی مولوی یا غیر مولوی یہی اعتراض کرے تو کیسا لگے گا۔ تلووں کی لگی سر سے نکل جائے گی.....

حوا نے آدم سے کہا ہوگا' سنتے ہو جی' یہاں سے چلو یہاں ہنسی ہنسی میں بھی بات کرنا مشکل ہے۔''

زنانہ کرداروں میں پڑوسی کی بیوی کی گفتگو بھی اسی اداکاری کا کمال ہے۔ اسی طرح ریشائیہ میں داڑھی کے بارے میں خواتین کی فقرے بازی بھی ان کے کمال فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کبھی فتراک میں تیرے'' کی بھلکڑ خاتون کے روپ میں بھی یہی مختار زمن ریختی بولتے نظر آتے ہیں۔

''لو بھلا ایسی مزے دار بات یاد نہ ہوگی؟ اے بھئی ذہن پر زور ڈالو' ہم لوگ جامن والے گھر کے آنگن میں بیٹھے تھے نا.....اور ہاں اسی دن آپا نے نئی کڑھائی منگائی تھی جس میں تم نے مرچیں تلی تھیں.....اے باجی بھول گئیں؟ تم جھولنے والی کرسی پر بیٹھی تھیں..... وہی جس پر

سے عید کے دن چھمن آپا گری تھیں۔ہم لوگ جامن کی طرف والے حصے میں بیٹھے تھے.....وہی بھئی جدھر حکیم صاحب کی حویلی تھی.....
اتنے میں وہ صاحب آ گئے۔دادا ابا کے دور کے رشتے کے بھانجے۔اور تم نے دکھتے ہی تین چار دفعہ زور زور سے ''اخ تھو'' کہا۔بیچارے ہکّا بکّا رہ گئے۔تم سدا کی بدتمیز ہو.....بھلا کیوں یہ حرکت کی تھی تم نے .....بیچارے دیکھتے رہ گئے.....اپنی چگی داڑھی ہلا کر۔'''

''.....ایک دفعہ ایک بزرگ نے موصوفہ اور ان کے میاں کو کھانے پر بلایا ان کے علاوہ کھانے پر ایک صاحب کپتان احمد بھی مدعو تھے۔کھانا شروع ہونے سے پہلے ڈرائنگ روم میں باتیں ہوتی رہیں۔موصوفہ نے کپتان صاحب سے بڑی زوردار بحث کی۔یادداشت کی بناء پر نہیں، تجربے کی بناء پر کہتا ہوں کہ کپتان صاحب کو یقیناً چت کر دیا ہوگا، پھر کھانے کی میز پر گئے وہاں باتیں ہوا کیں۔خوب اچھی طرح دیکھ بھال لیا۔اگلے دن اتفاقاً ایک نمائش میں جانا ہوا۔وہاں بھیڑ بھاڑ بہت تھی۔موصوفہ موصوف سے بچھڑ گئیں۔خیر کچھ دیر تلاش کیا تو کیا دیکھا کہ ایک جگہ کھڑی ہوئی کسی فوجی افسر سے باتیں کر رہی ہیں جو ان کے میاں کے ملاقاتی تھے۔علیک سلیک ہوئی۔دو چار منٹ کے بعد میں نے کہا، چلو اب گھر چلیں۔
چلنے لگے۔دو چار قدم جا کر نہایت فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ موصوف کو دیکھا۔تیرِ نظر چلایا اور فرمایا۔
''دیکھا آپ نے' آپ خواہ مخواہ کہتے ہیں کہ بھلکڑ ہیں۔کیسا پہچانا میں نے کپتان صاحب کو' حالانکہ آج وہ یونیفارم میں تھے۔اور کل جب دیکھا تو سوٹ پہنے ہوئے تھے''۔

''کون کپتان صاحب؟ میاں نے پوچھا

''اون (چڑ کر) کون کپتان صاحب' بن رہے ہیں آپ ہار گئے نا''

شوہر نامدار تاڑ تو گئے' لیکن چڑانے کے لئے کہا۔

''آخر بتایئے تو سہی' میں نے کسی کپتان و پتان کو نہیں دیکھا یہاں''۔

ارے یہی صاحب' جن سے باتیں ہو رہی تھیں جن سے کل چچا میاں کے یہاں کھانے پر ملے تھے-کل کی بحث میں جو دو چار پوائنٹ رہ گئے تھے میں نے آج وہ بھی داغ دیئے۔ بیچارے ہکا بکا رہ گئے.....''

میاں نے قہقہہ لگا کر کہا''خوب'' جن سے آپ باتیں کر رہی تھیں' وہ تو لفٹیننٹ بخاری تھے جن کی بچی ہماری نجمہ کے ساتھ پڑھتی ہے۔ اور ایک دو دفعہ وہ ہمارے گھر آئی تو بخاری صاحب اسے لینے بھی آ چکے ہیں.....اور جو صاحب کل کھانے پر ملے تھے وہ کپتان احمد تھے۔''

سٹپٹا گئیں اور بولیں.....''اوں' تو یہ وہ نہیں تھے' ناک تو ویسی ہے لمبی بھی اور سر بھی نیم گنجا تھا اور مونچھیں بھی کافی خوفناک تھیں.....ارے کہیں آپ ہی غلط نہ سمجھے ہوں''

انہیں زنانہ گفتگو کا لپکا ہے۔ لیکن مردانہ گفتگو میں بھی بھی بند نہیں۔ مردانہ پن اور لغات النساء کا امتزاج ان کا اسلوب خاص ہے جس پر ان کے دوست احباب مرتے ہوں۔ مختار زمن کا ریٹائرمنٹ پر یہ حال ہے تو خدا جانے جوانی میں کتنے ستم ڈھاتے ہوں گے۔

مختار زمن اس صدی کی دوسری دھائی کی پیدائش ہیں۔ راقم الحروف بھی اسی زمانے میں پیدا ہوا۔ ہمارے دور میں ابھی پرانے بزرگ زندہ تھے اور بعض تہذیبی روایتیں بھی باقی ہیں۔

◆❖⌘

شیخ عبدالشکور کی ''سبزۂ بیگانہ''

گوہر جان پر اپنا مضمون ختم کرتے ہوئے عبدالشکور ایک لطیفہ بیان فرماتے ہیں۔

''گوہر جان کی مجلس میں کئی پٹھان بھی تشریف فرما تھے۔ چنانچہ ایک خان صاحب نے کھڑے ہو کر پشتو راگ کی فرمائش کی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ گوہر یہ راگ اتنی خوش اسلوبی سے نہ سنا سکے گی۔ جتنی خوش اسلوبی سے پہلے راگ سنا چکی تھی لیکن وہ تو بلا کی رقاصہ تھی اور بہت سی زبانوں کے راگ اور متعلقہ نامے سے واقف تھی۔ اس نے ایسا نفیس جہیز نامہ شروع کیا کہ ناچتے ہوئے سر کو پاؤں مارتے اتنا جھکا لیتی تھی کہ زمین کو چھونے لیتا۔ ایسا مسکن اور انوکھا ناچ دیکھ کر سب حضرات انگشت بدنداں رہ گئے اور پٹھانوں نے لوشے لوشے کہہ کر داد دی۔ ناچ ختم ہوا تو اس خان صاحب نے کھڑے ہو کر یوں کہا۔ ''ووئی گوہر جان قربانیت شوم نام افغاناں روشن کردی''۔

''سبزۂ بے گانہ'' کو پڑھ کر میرا تاثر بھی کچھ اسی طرح کا تھا اور دس بار بار بار پکار اٹھتا تھا کہ ووئی شیخ عبدالشکور قربانیت شوم نام ادیباں روشن کردی، یہ جھومر ناچ سبزۂ بیگانہ کی صورت میں آپ کے سامنے ہے ہماری شیخ کی عمر بھر کی کمائی ہے۔ صوفیائے کرام جب شاعری کرتے تھے تو تذکرہ نگار بالعموم ان کے حالات اور کلام کے اندراج کے بعد یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ شاعری

اوں مرتبہ ایشاں است۔ ہمارے شیخ کے کمالات کا بھی ایک تھوڑا حصہ ہی اس کتاب میں ظاہر ہوا ہے۔ وہ معلومات کے لحاظ سے لاہور کی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ ہر محلے کے بزرگ کا ظاہر اور باطن جناب شیخ کے سامنے کھلی کتاب کے طور پر موجود ہے۔ لاہور کی گزشتہ سوسوا سو کی تاریخ انہیں ازبر ہے ناظرین اس سے یہ تاثر ہرگز نہ لیجئے کہ خدانخواستہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں جو چھڑی دکھائی دیتی ہے وہ بڑھاپے کا سہارا ہرگز نہیں۔ اسے انہوں نے یا تو آوارسگاں کو خاموش کرنے کے لئے اپنا رکھنا ہے یا پھر یہ کوئی طلسماتی شے ہے جس کی مدد سے ہمارے شیخ جنوں اور پریوں کو مسخر کرتے ہیں۔ تسخیر جنات کا عمل شیخ کی کرامتوں سے ہے۔ البتہ اس کا پتہ نہیں چل سکا کہ ان کے حلقے میں مریدوں کی تعداد زیادہ ہے یا مریدنیوں کی۔ شیخ کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ علم ومجلس میں پناہ ہیں۔ وہ ان محفلوں کی نشانی ہیں۔ جن میں شرفاء اپنے بچوں کو تربیت کے لئے ڈیرہ دار طوائفوں کے ہاں چھوڑ جایا کرتے تھے اور پھر کبھی واپس نہیں جاتے تھے۔ مہاراجہ کپورتھلہ کے دربار میں باریابی کے بعد شیخ کے یہ جوہر کھلے اور اب تک کھلے ہیں آ رہے ہیں جو ہر شناسی اور معاملہ فہمی کا ایسا دلفریب امتزاج پایا جاتا ہے کہ اس زمانے میں بایدوشاید ملے۔ آداب محفل سے آگاہی۔ شعروادب کا ذوق، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی بات سے بات پیدا کرنے کا سلیقہ، رعایت لفظی سے خلع جگت تک، ہر مرحلہ ان کی نازک خیالی اور نکتہ آفرینی کا تبین ثبوت ہے۔ خوش گفتاری کے گھوڑے پر سوار ہو کر جب شیخ اپنی خانقاہ سے برآمد ہوتے ہیں تو مریدان خاص جنہیں وہ اپنی صوفیانہ اصطلاح میں خلیفہ کہتے ہیں، روحانی فیوض و برکات کے منتظر ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں شیخ کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ان ملفوظات کا بڑا ذخیرہ ابھی تک قلم بند ہونے کا محتاج ہے۔ ''سبزۂ بے گنا'' میں ایک سماجی شعبدہ باز گرامی صاحب، حضرت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، صلاح الدین احمد اور گوہر جاں اس خطبہ خزانے کی صرف ایک معمولی سی جھلک ہے۔ شیخ اگر معلومات کے باقی ماندہ ذخیرے کو اپنے ساتھ لے گئے تو ہماری تمدنی تاریخ اور شہر لاہور کی صحافتی زندگی کا بہت بڑا حصہ زیر زمین چلا جائے گا۔ مظفر بھٹہ صاحب نے شیخ کے کمالات کی ایک جھلک ہمارے لئے

محفوظ کردی ہے۔ وہ شیخ کو بے راہ روی سے روک کر لاہور کی عظمت رفتہ کو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر سکیں۔ یاد رہے کہ ان ملفوظات کا ایک حصہ ''مفاد عامہ'' کے خلاف بھی ہوگا۔ اسے بہ آسانی بعد میں لفافے میں کتاب کے ہمراہ دیا جا سکتا ہے۔ بادل نے کمالات روحانی و غیر روحانی کے جو نمونے ہمیں اس کتاب میں ملتے ہیں، ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس بادل میں ابھی برسنے کے وسیع امکانات موجود ہیں اور موصوف جب جوان ہوں گے کیا قیامت نہیں ٹوٹے گی۔ ابھی سبزہ بیگانہ کا آغاز ہے۔ خیر سے ہمارے پیر و مرشد کی یہ پلوٹھی کی کتاب ہے۔ پلوٹھی کا بچہ سب کی آنکھوں کا تارا ہوتا ہے۔ خاص کر جب اس کا ناک نقشہ بھی اچھا ہو۔ چال ڈھال میں بھی، اسلوب میں بھی، شیخ کا علم گفتار سے دو قدم آگے ہے۔ ان کی تحریر میں وہ پختگی ہے جو آج کل کے اچھے اچھے لکھنے والوں کو نصیب نہیں۔ ہمارے دوستوں میں ایک انتظار حسین ہیں جو کبھی کبھی محاوروں کی پوٹلی سے ایک آدھ کرتب برآمد کر لیتے ہیں۔ ورنہ صاحبِ اسلوب ادیبوں کا وہ قحط ہے کہ شیخ کا دم غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ وہ سرد و گرم عالم چشیدہ ہیں اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے ہیں۔ اس لئے انہیں بات کا کہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ ان کی تحریر میں افسانہ نویسی کے سارے گن بھی موجود ہیں۔ جن کا اظہار انہوں نے کتاب کے آخری حصے میں اخذ شدہ کہانیوں میں کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہاں مار کھا گئے ہیں اور دوسروں کے مال کو دوسروں کا مال کہہ کر پیش کر دیا ہے اور اپنے حصے میں صرف انداز بیان کی قدرت اور حسن کو رہنے دیا ہے۔ ورنہ کچھ عجب نہیں کہ آج ان کا شمار بھی چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا۔ بہر حال ہم تو ان کے لئے دعا گو ہیں اور یہی کہہ سکتے ہیں کہ قربانیت شوم نام ادیباں روشن کردی۔

◆❖⌘

اُردو ڈائجسٹ

حضرات!

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہم جس رسالے کی پچیسویں سالگرہ منا رہے ہیں اس کا مدیر اپنی پندرھویں سالگرہ منانے میں مصروف ہے۔ الطاف حسن قریشی جوان بلکہ نوجوان ہیں۔ ان میں جوانی کی مستعدی بھی ہے اور حالات سے دست و گریباں ہو جانے کا حوصلہ بھی۔ وہ سیاسی تجزیوں میں خوفناک حد تک صاف گو اور بے تدبیری کی حد تک جرأت مند ہیں۔ صحافی نہ ہوتے تو سیاست دان ہوتے کیونکہ وہ سیاست دانوں کے سارے لچھن جانتے ہیں۔ تحریر میں اثر پیدا کرنے کے لئے اختر شیرانی اور اس کے معاصرین کا رنگ استعمال کرتے ہیں اور موقع ملے تو قلم کی بجائے تلوار سے بھی کام لے گزرتے ہیں۔ وہ پرلے درجے کے دہشت گرد ہیں۔ ان کا کوئی سا تجزیہ اٹھا کر دیکھئے' کوئی سا انٹرویو پڑھ جائیے' قریشی پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بہت خوفناک بلکہ حوصلہ شکن باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ان بھیانک روداد وں کو پڑھ کر قاری بیچارہ سہم سہم جاتا ہے اور اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ آج کل میں یہ مملکت خداداد پاکستان مزید کسی آفت میں مبتلا ہونے والی ہے۔ قدرت کے کھیل نیارے ہیں' قرب قیامت کے یہ مناظر اکثر سچ نکلتے ہیں۔ اس حسن اتفاق کو الطاف حسن قریشی اپنا کارنامہ اور حقائق کا صحیح ادراک سمجھتے ہیں اور اس پر ناز بھی

کرتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ہماری کہی ہوئی دس بارہ باتوں میں سے دو چار تو ضرور سچ نکلتی ہوں گی' لیکن ہم نے محض اس بناء پر کبھی اپنی لیاقت اور ذہانت کا دعویٰ نہیں کیا۔

الطاف حسن قریشی حق گوئی کی پاداش میں ایک دو بار جیل بھی جا چکے ہیں اس کی خبر ہمیں یوں لگی کہ دوست احباب ان کے جیل جانے پر ہم سے آ کر اظہار ہمدردی کرتے رہے۔ ہم کہ ایک عرصے تک اردو ڈائجسٹ میں مضامین لکھتے رہے اور ہمارے بعض قارئین اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے رہے کہ الطاف حسن قریشی' اعجاز حسن قریشی کے تیسرے بھائی وحید قریشی ہیں۔ یہ ضروری تو نہیں کہ سب قریشی ایک جیسے یا ایک ہی قسم کے قریشی ہوں۔ فنون میں شائع ہونے والے جملہ قاسمی جس حساب سے بڑے قاسمی کے بھائی بند ہیں' بس ہمارا اور قریشی برادران کا رشتہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم نے اکثر کوشش کی کہ اس غلط فہمی کا فائدہ اٹھا کر قریشی برادران کی جائیداد پر دو چار ہاتھ مار لیں' لیکن افسوس آج کا ادیب بڑا ہی بے فیض ہے' فریب دینا جانتا ہے فریب کھانا نہیں جانتا۔

خاندانی مشابہت سے قطع نظر ہمیں اسی مشابہت کے بھی کئی نادر موقعے ملے ہیں' جب تک لاہور میں قیام رہا، فیروز سنز کے ڈاکٹر عبدالوحید کے کارنامے ہمارے نام سے منسوب ہوتے رہے' اسلام آباد میں ہماری بدنامیاں ڈاکٹر وحید الزماں سمیٹ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد خان کا نامہ اعمال فرشتے اکثر عملہ ڈویژن کے آفتاب احمد خان کے حساب میں درج کر دیتے ہیں۔ اردو کی ایک ادیبہ نے تو یہاں تک کمال کر دکھایا کہ جب بھی ہمارا تعارف کسی سے کرایا یہی کہا کہ یہ مولانا وحید الدین سلیم ہیں۔ اس سے بہر حال کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ سوائے اس کے کہ تاریخ کا معاملہ ''ذرا سا'' چوپٹ ہو جاتا ہے۔ تاریخ کا معاملہ کچھ ایسا توجہ طلب بھی نہیں۔ تاریخ آج تک ہمارے کسی کام نہیں آ سکی۔ حتیٰ کہ ہم نے اس سے عبرت کا سبق بھی نہیں لیا۔ آخر تاریخ میں کیا رکھا ہے۔ ہم اسے پچھلے چالیس برس سے برابر مسخ کرتے چلے آئے ہیں' ملک بھر بھی زندہ ہے اور اس کی تاریخ بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔

تاریخ کا ذکر چلا ہے تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ قریشی برادران یہاں بھی باز نہیں آئے۔تاریخ کے ساتھ ان کی چھیڑ چھاڑ برابر جاری رہتی ہے۔اردو ڈائجسٹ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں تاریخی حقائق کے بعض ایسے گوشے ظاہر ہوئے جنہیں بڑی قومیں ہمیشہ چھپا کے رکھتی ہیں اور طشت از بام ہونے پر واٹر گیٹ سکینڈل کہتی ہیں۔قریشی صاحب ہمیں چھوٹی قوموں کی صف میں کھڑا کر کے مشرقی پاکستان میں سر اٹھانے والے حالات کی پہلے سے خبر دے دیتے ہیں۔ہمیں ان کے کہے کا یقین نہیں آیا اور صرف اس کی تصدیق کے لئے ہم آدھا ملک دینے پر آمادہ ہو گئے۔تاریخی حقائق کی تصدیق کا یہ بڑا مہنگا سودا تھا جو قریشی صاحب کی خاطر ہمیں برداشت کرنا پڑا۔اسی طرح بھارت کی دو جنگوں کی روداد کے پس پردہ محرکات کہ طول طویل سلسلے بھی قریشی صاحب کی جولانگاہ خاص ہیں۔کوئی دوسرا ہوتا تو سرکاری راز فاش کرنے کے الزام میں دھر لیا جاتا۔شروع شروع میں تو قریشی صاحب بھی ایک آدھ بار سچ بول کر داخل زنداں ہوئے تھے' لیکن بڑے لیڈر اور بڑے صحافی عموماً اپنی گرفتاری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ان کی اسیری اور رہائی سے انہیں نیک نامی ملی اور ان کی دھاک پہلے سے زیادہ بیٹھی۔وہ پہلے کے مقابلے میں بڑے دانش مند بلکہ دانش ور کہلائے اور بغیر گرفت میں آئے سرکاری راز اگلنے کا اسلوب انہیں معلوم ہو گیا۔

ہماری رائے میں الطاف حسن قریشی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔اردو ڈائجسٹ کے تازہ شمارے میں انہوں نے آپریشن جبرالشر' پیش کیا ہے' اور پوری قوم کو کشمیر کے محاذ پر آئینہ دکھایا ہے۔ ہم اصل میں کیا ہیں اور ہمارا ظاہری روپ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب تو آپریشن جبرالٹر ہی میں پنہاں ہے۔قومی تضادات کو بیان کرنے کے لئے پتھر کا جگر چاہئے۔اس راز کو پندرہ بیس برس تک سینے میں دبائے رکھنے کے لئے تو لوہے کے اعصاب درکار ہیں جو خال خال ہی میسر آتے ہیں۔اردو ڈائجسٹ کے روبوٹ میں یہ توانائی غالباً اس طویل دوڑ کا نتیجہ ہے جسے الطاف حسن قریشی ''صبح کی سیر'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔یہ تو اب پرانی بات ہے آج کل وہ یہی توانائی ملکوں

ملکوں کی سیر سے کشید کرتے ہیں۔ پی آئی اے کا طیارہ ہر وقت ان کے پاؤں کے ساتھ بندھا رہتا ہے۔کبھی سعودی عرب، کبھی لبنان، کبھی فلسطین، کبھی مصر، کبھی عراق، کبھی امریکہ اور کبھی انگلستان.....جغرافیہ یاد کرنے کا اس سے زیادہ سستا طریقہ دریافت نہیں ہوا۔لیکن ایک بات اہم ہے کہ اتنا اونچا اڑنے کے باوجود وہ اپنا ماضی نہیں بھولتے۔جبھی تو ان کا ہر انٹرویو ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے سے شروع ہوتا ہے۔ پرانے زمانے میں اس طرح کی پیشہ وارانہ کاریگری کو اساتذہ ''مضمون کا چہرہ باندھنا'' کہتے تھے۔ ہمارے قریشی صاحب تو بعض اوقات چہرہ باندھنے کی بجائے مضمون کی پوری ''رسم دستار بندی'' تک ادا کر جاتے ہیں۔

حضرات!

اردو ڈائجسٹ میں سیاست دانوں کی پگڑیاں اچھالنے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ جاسوسی ناولوں کے ترجمے، روس کی دورن خانہ کشمکش، مزاحیہ مضامین، شاعری، کتابوں پر تبصرے اور اشتہارات بارہ مصالحے کی چاٹ اردو میں اپنی طرز کی پہلی چیز تھی جس کے قارئین اردو ادیب نہیں اردو کے عام خواندہ افراد ہیں۔ چنانچہ پاکستان میں اس کی نقل میں کئی ڈائجسٹ ابھرے اور ڈوبے۔اردو ڈائجسٹ کی ناؤ بھی ابھرتی ڈوبتی رہی لیکن قریشی برادران قریشی ہونے کے ناطے سے تجارت کا ڈھنگ بھی جانتے ہیں کہ وہ قارئین کی نبض پہچانتے ہیں۔اس لئے ہر آن نئی نئی تبدیلیوں کی مدد سے وہ اپنی کشتی کو بھنور سے باہر نکال لاتے ہیں۔ان کے ہاں ہر ذوق اور ہر پسند کا مال موجود ہے۔ میرے ایک دوست اردو ڈائجسٹ محض اس لئے خریدتے ہیں کہ وہ صرف اشتہار پڑھنے کے عادی ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اس رسالے میں اگر اس رنگ کا موادِ خواندگی اس وافر مقدار میں موجود ہے تو باقی صفحات کی کل تعداد کیا ہوتی ہوگی؟ مجھے اس کا جواب نہیں آتا۔ میں ہمیشہ ریاضی میں کمزور رہا ہوں۔

تیکھے تیور

الطاف حسن قریشی صاحب نے میرے لئے ''تیکھے تیور'' کا موضوع تجویز کیا ہے۔لیکن حیران ہوں کہ بات کہاں سے شروع کروں۔کبھی قریشی صاحب کے تیکھے تیور دیکھتا ہوں اور کبھی ہوٹل ایمبیسڈر کے یہ زمین دوز مورچے کی یہ چھت جہاں فوجی ادیبوں کا پورا بریگیڈ جمع ہے۔یوں تو اس ادبی دستے کی کمان بریگیڈیئر گلزار احمد کے حصّے میں آئی ہے۔لیکن ان سے آنکھ بچا کر کرنل محمد خان اس مہم کو سر کرنے کے لئے نکلے ہیں۔میجر ضمیر جعفری اور کیپٹن صدیق سالک کی سپاہیانہ کارگزاریاں بھی کچھ کم قابل توجہ نہیں۔''تسخیر لاہور'' کی اس مہم میں وہ بھی ہم رکاب ہیں۔جب کوئی پلٹن فتح کرتی ہے تو فتح کا سہرا عموماً مہم کے سربراہ کی سر ہوتا ہے۔لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ضمیر جعفری اور صدیق سالک کی تحریریں کرنل محمد خان کے کھاتے میں ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔کہنے کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ آج کی تقریب کے ''شریکِ غالب'' کرنل محمد خان ہیں۔اہل لاہور نے ان کے سامنے ہتھیار ڈالے تو اس کامیابی کا سہرا ضرور کرنل محمد خان کے سر جائے گا۔تقریب کی کامیابی کرنل محمد خان کے لئے اور سرخ روئی میرے دوست الطاف حسن قریشی کے حساب میں ہے۔لیکن قریشی صاحب کی ادیبانہ صلاحیتوں کے علاوہ ان کی حسابی سوجھ

بوجھ کا بھی قائل ہوں۔انہوں نے فوجی ادیبوں کے مقابلے میں غیر فوجی ادیبوں کو بھی صف آراء کیا ہے۔تقریب کا یہ Double Entry System اس لحاظ سے اہم ہے کہ فوجی بھائیوں کے سالار اگر کرنل محمد خان ہیں تو غیر فوجی ادیبوں کی کمان سید وقار عظیم کے حصے میں آئی ہے۔کہا جاتا ہے کہ دو بادشاہ ایک ملک میں اور دو فقیر ایک گلیم میں نہیں رہ سکتے۔فقیروں اور مملکتوں کا قصہ دوسرا ہے ادب کی دنیا تو انصاف کی دنیا ہے۔اس گھاٹ پر تو سبھی ایک ساتھ پانی پی لیتے ہیں۔

کرنل محمد خان نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور اپنے تجربات کو ''بجنگ آمد'' میں محصور کر رکھا ہے۔''جگ بیتی'' ایک ہلکی پھلکی روداد ہے۔جنگ کے ہولناک مناظر اور فوجی زندگی کے کھردرے اور بے کیف لمحات کو مصنّف نے ایک زندہ دل انسان کی حیثیت سے گرد وپیش کو دیکھا ہے اور زندگی کی تازگی اور تمازت کو محسوس کیا ہے۔مصنّف کو واقعات کی ہولنا کی اور صبر آزمائی کو ایک شان بے نیازی سے برداشت کرنے کا گر آتا ہے۔اس کی شگفتہ مزاجی اور شگفتہ بیانی زندگی کی تلخی کو ناسور بنانے کی قائل نہیں۔اس کے ہاں زندگی کی گھٹن اور تلخی کی جگہ حالات سے بھرپور لذت حاصل کرنے کا شعور موجود ہے۔اردو ادب میں یہ ''محمد خانی روّیہ'' نئی چیز ہے۔ہمارے مزاح نگاروں میں طنز نگار تو خاصی مقدار میں پائے جاتے ہیں (اور کبھی کبھی دساور کو بھی بھیجے جاتے ہیں) لیکن مزاح نگار ذرا مشکل سے ملتے ہیں۔محمد خان کو بھی اس ''جنس کم یاب'' میں سے سمجھنا چاہئے۔وہ قہقہے کی بجائے ''تبسم زیرلب'' کے قائل ہیں اور یہی زیرلبی ان کا خاص فن ہے اگر کبھی عتاب کی نوبت آتی ہے، وہاں بھی بقول اقبال:

خراب لذت آنم کہ چوں شناخت مرا
عتابِ زیر لبی کرد و خانہ و یراں گفت

محمد خان بھی اپنے نرم ونازک لہجے میں وہی معشوقانہ روش اختیار کرتے ہیں جس کی رو سے اقبال کا عاشق سرِ راہ چھیڑ چھاڑ کا جواب محض ''مرنا جانا' ٹٹ پینا'' جیسے فصیح و بلیغ جملوں میں پاتا ہے۔حالات سے اس طرح کی مفاہمت محمد خان جیسے خالص مردانہ نام سے بظاہر کچھ مناسبت

نہیں رکھتی لیکن اس جیالے فوجی کے جسم میں ایک شائستہ اطوار اور باذوق حسینہ کا دل و دماغ پوشیدہ ہے۔فوجی ٹریننگ کی سختیوں اور ڈسپلن کی ''بار برداری'' کے لمحات میں محمد خان حالات کا جائزہ کچھ اس طرح لیتے ہیں:

''اس کے بعد ڈرل شروع ہوئی اور خوب تیزی اور تندی سے حکم ملنے لگے۔سیدھے دیکھو۔چھاتی باہر۔ٹھوڑی اوپر۔بازو ہلاؤ۔ ہالٹ' ہلومت' مکھی مت اڑاؤ' ہنسومت' ان سب میں ''ہلومت'' کے حکم پر عمل کرنا عذاب عظیم تھا۔سیدھے بت بنے کھڑے ہیں کہ کان پر کھجلی محسوس ہوتی ہے۔اب ہاتھ کو جنبش دینا جرم ہے۔کندھا کان تک نہیں پہنچ سکتا۔کان کا خود ہلنا منشائے فطرت نہیں اور وہاں تک ہاتھ لے جانا منشائے سارجنٹ نہیں۔عین اس وقت ایک مکھی ناک پر نازل ہوتی ہے۔مکھی کو فنا کرنے کی ہے پناہ خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے لیکن سارجنٹ سے آنکھ بچانا کراماً کاتبین سے آنکھ بچانا ہے۔مکھی پر دست درازی کا خیال آتا ہے تو سارجنٹ گویا ہاتھ ہلانے کے خیال ہی کو دیکھ لیتا ہے اور اپنی کاکنی انگریزی میں چلاّ اٹھتا ہے۔Don`t Kill no fly یعنی مکھی مت مارو۔ ہاتھ وہیں کا وہیں سوکھ جاتا ہے اور مکھی نہایت اطمینان سے ناک کے نشیب و فراز کا معائنہ کرتی ہے۔اسے اشتعال انگیز حالات میں بے حرکت کھڑے رہنا صحیح معنوں میں نفس کشی تھی۔اس وقت زندگی کی واحد خواہش صرف اتنی ہوتی ہے کہ کب ڈرل ختم ہو اور جی بھر کر ناک اور کان کھجائیں۔(ص ۳۱۔۲۳)

ہولناک اور پریشان حالات میں مضحک واقعات کی تلاش بھی محمد خان کے اسلوب کا خاصا ہے۔

''شیر باز سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس کا ایک انگریز صاحب

قبائلیوں کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور بڑی مشکل سے اس کا شناختی کارڈ اور دوکان واپس ملے تھے۔ ہمارے اطمینان کے لئے شیر باز نے اتنا اضافہ کیا کہ تم فکر مت کرو وہ مسلمان کا لاش خراب نہیں کرتے'' (ص ۵۰)

''شائبہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ انڈین ونگ میں اگرچہ اکثریت انگریز افسروں کی ہے تاہم ہندوستانی افسروں کی تعداد بھی خاصی ہے، چنانچہ خوشی ہوئی .....مگر ابھی بستر نہ کھلا تھا کہ حکم ملا'' تم برٹش ونگ میں قیام کرو..... چار ماہ کے ناپختہ سیکنڈ لفٹیننٹ کو اپنی برادری کے ادھیڑ کر اجنبی گوروں یعنی مخالفین کے سپرد کر دینا، سامراجی تشدد کی ایک اور مثال تھی لیکن کانگرسی نہ تھا کہ لاری کے آگے لیٹ جاتا۔ بس دانت پیس کر زیرِلب ہی اپنے جذبات کا اظہار کر لیا.....(برٹش ونگ میں) ایک گورا سپاہی ہمیں بطور اردلی ملا۔ اس نے آتے ہی ہمیں سلیوٹ کیا اور بغیر بات کے ہمارا بستر لگایا۔ سامان قرینے سے رکھا۔ جوتے پالش کئے اور چائے لایا۔ ایک انگریز کو یوں دن دہاڑے اپنی خدمت کرتے دیکھ کر محسوس ہوا جیسے سچ مچ ہماری صاحبِ قرانی کی ابتدا ہو رہی ہے..... جب گورا اس خدمت سے فارغ ہو چکا تو پہلی مرتبہ ہم سے ہم کلام ہوا لیکن کلام کیا تھا ایک لہرائی سی انگریزی نما آواز ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ لیکن ہمارے دماغ پر کوئی قابل فہم نقش نہ چھوڑا۔ ہمیں خاموش دیکھ کر گورے نے اپنی بات دھرائی۔ لیکن ہمارے دماغ کے نقش بدستور دھندلے اور تجریدی قسم کے تھے۔ گورا اب خاموش کھڑا تھا۔ سوچا کہ کیوں نہ ہم ہی کچھ کہیں۔ چنانچہ گلا صاف کیا اور اپنی بہترین انگریزی میں اظہار مدعا کیا۔ گورے اردلی نے ہماری انگریزی کی داد میں ایک مخلصانہ مسکراہٹ ضرور پیش کی

لیکن جہاں تک اس انگریزی کے ادراک کا تعلق تھا ظاہر ہے کہ غریب سراسر معصوم تھا۔ بغیر مزید تجربے کے ہم نے طے کیا کہ ہماری اور گورے کی گفتگو میں کوئی نقطۂ اتصال نہیں اور یہ کہ اگر ہم نے مشق سخن جاری رکھی تو ہماری انگریزی زبان بالکل امتیازی ہوگی۔ ایک دوسروں کو چھوئے بغیر چلتی رہیں گی۔ چنانچہ زبان کی بجائے ہاتھوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور بلا تکلف ایک دوسرے کو سمجھنے لگے۔

بقول داغ:

''ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے''

(ص ۷۵)

''میمیو کے ویرانے میں بہار آئی تو ہمارے لئے پھولوں کی بجائے تاج لائی یعنی ہماری موعودہ پروموشن کا حکم آ گیا اور ہم میجر بن گئے .....ہمارے تین ماتحت کپتانوں میں سے دو انگریز تھے۔ وہی انگریز جن کی ملازمت کرتے کرتے ہم نے لاکھوں کے بول سہے تھے۔ یوں تو جنگ انگریز کی غلطی تھی ہم دیسی ان کے سینئر ہو کر لڑتے یا جونیئر ہو کر بہرحال ان کی خاطر ہی لڑ رہے تھے۔ لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ انگریز افسروں کو چاروں شانے ماتحت پایا اور انہیں سلیوٹ کرنے اور یس سر کہتے سنا تو وطن کی غلامی کا کچھ غم ہلکا ہو گیا۔ جی تو چاہتا کہ ان سے کوئی ٹھوس سا قصور سرزد ہو تو انہیں سزا دے کر تھوڑا سا جلیانوالہ کا بدلہ بھی لیا جائے لیکن انگریز کم بخت اتنا اچھا حاکم نہیں جتنا اچھا ماتحت ہے۔ ایسی بے عیبی سے ماتحتی کرتا ہے کہ انتقام لینے کی بجائے انعام دینے کو جی چاہتا ہے'' (ص ۲۴۴)

محمد خان صاحب کا ''عتاب زیر لبی'' کچھ اسی طرح کا نرم و نازک شائستہ اور حیادار سا ہے۔ تیکھے تیوروں کا یہ ایک روپ ہے۔ دوسرا روپ ذخیرۂ الفاظ اور واقعات کے عام بہاؤ کے درمیان عدم تناسب سے پیدا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

''ہمارا بریگیڈ پہلی مرتبہ جنگ لڑ رہا تھا۔ دشمن کی دور مار توپوں کے گولے ہمارے سروں کے اوپر سے گزر رہے تھے اور ایسا کرنے میں ہمیں زندگی بھر کے لئے ممنون کر رہے تھے کیونکہ وہ اصل میں ہمارے استفادے کے لئے ہی پھینکے جا رہے تھے اور اگر سر سے گزرنے کی بجائے وہیں نازل ہو جاتے تو ہم نہ صرف مستفید ہوتے بلکہ متوفی بھی''۔ (ص ۱۴۸)

ایک اور جگہ لیفٹیننٹ پیٹرسن کی آتش فشانی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''ایک دن کیمپ کے ایڈجوٹنٹ بنگو فنک شرف ملاقات حاصل کرنے کے بعد نکلے تو ان کی آنکھ کے گرد ایک بے عیب سا آبنوسی ہالہ تھا جو کرنل صاحب کے زور بازو کا نتیجہ تھا۔ دوسرے دن سیکنڈ ان کمانڈ میجر بربٹ برآمد ہوئے تو ان کے کپڑوں پر روشنائی کی ایک وسیع اور دلکش سی افشاں تھی جس کا یہ مطلب تھا۔ ایک دوات کا خون ناحق بھی کرنل صاحب کے سر ہے۔ غریب ہیڈ کلرک کے ماتھے پر تو ایک مستقل مخروطی رورا ابھرا رہتا تھا جس کی تازگی میں کوئی کمی نہ آتی تھی کہ کرنل صاحب مناسب وقفوں کے بعد اپنے پیپر ویٹ سے اس کی تجدید کرتے رہتے تھے''۔ (ص ۱۷۸)

کرنل محمد خان مزاح کے لئے اشعار، مصرعوں اور نیم مصرعوں کا اکثر سہارا لیتے ہیں:

''تھوڑی دیر بعد ساتھ کے کمرے میں کھانے کے لئے گئے۔ انگریزی کھانے اور دیسی کھانے کے انداز میں تقریباً وہی فرق ہے جو انگریزی اور اردو بولنے میں ہے۔ جس طرح ایک نو آموز کی زبان سے انگریزی

الفاظ یا محاورے پھسل پھسل جاتے ہیں، اسی طرح ہمارا انگریزی مٹر گوشت بھی ہمارے اناڑی چھری کانٹوں کی زد میں نہ آتا تھا۔ادھر ہاتھوں سے کھانا خلاف شان تھا لیکن برضا و رغبت فاقہ کرنا بھی ممکن نہ تھا۔لہٰذا جس طرح بولتے بولتے انگریزی جواب دے جائے تو اردو پر ہاتھ یا زبان صاف کر لی جاتی ہے اسی طرح جہاں انگریزی چھری کانٹے سے کام نہ چلتا ہو ہم آنکھ بچا کر انگلیوں ہی سے بوٹی اچک لیتے۔'' گویا انگریزی کھانا اُردو میں کھا لیتے۔بعض حضرات البتہ ایسے بھی تھے جو لفٹینی کے احترام میں اوزاروں کی وساطت کے بغیر کوئی چیز حلق سے اتارتے ہی نہ تھے۔ان میں کئی ایک کو دیکھا کہ چھری کانٹا لئے پلیٹ میں مٹروں کا تعاقب کر رہے ہیں اور مٹر ہیں کہ ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے۔(ص ۲۷)

ان کے ہاں ظرافت اور شگفتگی کا یہ ایک نہایت کامیاب حربہ ہے۔اس کے علاوہ وہ مضحک شخصیتوں اور مضحک واقعات سے بھی دادِ فصاحت دیتے ہیں۔رام ناتھ کا خاکہ اس سلسلے کی خاص چیز ہے۔

''رام ناتھ اپنے سرٹیفکیٹوں کے علاوہ شکل وصورت سے بھی نیم جوانہ لگتے تھے۔آپ کا کپتان ہونا نہ صرف آپ کے مزاج کے منافی تھا بلکہ غالباً قضا وقدر کے ابتدائی منصوبے کے بھی خلاف تھا۔آپ کسی کام میں بھی کپتانی کرتے تو آپ سے حوالداری ہو جاتی۔پریڈ پر جاتے تو سپاہیوں پر دانت پیسنا شروع کرتے۔وردی پہنتے تو سر اور ٹوپی میں تسلی بخش ربط پیدا نہ ہو سکتا۔چائے پیتے تو ہونٹوں سے نہیں بلکہ پھیپھڑوں کے زور سے۔پیالی ہونٹوں کے قریب جاتی تو پھڑ پھڑانے لگتی اور خراد کی سی

آوازیں آنے لگتیں۔الغرض آپ چائے اسی اصول سے پیتے جس پر
جیٹ طیارے پرواز کرتے ہیں۔(ص۱۸۱)

محمد خان کی مزاح نگاری نہ طنز کی تلخی سے ملوّث ہے نہ حالات کی یورش کے سامنے بے دست و پا۔ ہلکے پھلکے طرز بیان، نرم و نازک لہجے اور البیلے طریقِ اظہار کی وجہ سے کرنل صاحب کی یہ کتاب اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک اہم اور خوشگوار اضافہ ہے۔

◆❖⌘

تادم تحریر

خواتین وحضرات!

''تادم تحریر'' دوادیبوں کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ ہے۔صدیق اور سالک نے اسے مل کر لکھا ہے۔ بالکل ایسے ہی چند سال پہلے دوادیب مل کر ایک اخبار نکالتے تھے اور دنیائے ادب میں مہر اور سالک کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ان دونوں کی تحریروں کو بھی الگ الگ پہچانا جا سکتا تھا۔اسی طرح صدیق اور سالک کی تحریریں بھی یک جا شائع ہونے کے باوجود الگ الگ پہچانی جا سکتی ہیں مثلاً کتاب کا دریچۂ اوّل سالک کا تحریر کردہ ہے اور سفرنامے صدّیق میاں نے لکھے ہیں۔صدیق میاں ذرا الہڑ اور ہتھ چھٹ ہیں اور مزاح میں کسی ایک سطح کے پابند نہیں۔خصوصاً عورتوں کا ذکر ہو تو علاّمہ اقبال کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بے خطر آتش نمرود میں کود پڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ان کے مقابلے میں دریچۂ اوّل، سوم اور چہارم کا سالک گھاگ مزاح نگار ہے۔گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے ہے اور تلوار کی دھار پر چلنے کا فن جانتا ہے۔معلوم نہیں یہ فن اس نے تربیت سے حاصل کیا ہے یا نسلاً بعد نسل اس تک پہنچا ہے کیونکہ ہم سب کے اجداد بقول شخصے یہ فن خوب جانتے تھے، جنگلوں میں رہتے تھے، شاخوں پر جھولتے تھے اور اچھل کود سے دل بہلاتے تھے۔پھر جب انسانیت ترقی کر گئی تو اس فن لطیف نے اداکاری اور پاپ میوزک کا

روپ دھارلیا۔اب اس کا مشاہدہ ٹیلی ویژن پر یا ثقافتی میلوں میں ہوتا ہے۔سالک راہ ورسم منزل سے بے خبر نہیں اس لئے میلوں، ٹھیلوں کا شیدائی ہے۔ وہ ترکِ دنیا سے زیادہ ترکِ آخرت پر یقین رکھتا ہے، شاید اس لئے ایکس رے رپورٹ ترتیب دیتے ہوئے انجام سے بے پرواہ ہوکر مارشل لاء اسلامی جمہوریہ پاکستان ''جمہوریت' اقتدار' آئین' بیوروکریسی کے بارے میں لکھتا چلا گیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ فوج میں نہ ہوتا تو جیل میں ہوتا:

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تخت جگہ آزادی کی یا تختہ مقام آزادی کا

مضامین سالک کو میں نے آغاز سے لے کر دمِ تحریر تک پڑھا ہے۔اس میں کچھ بچپن کا حال ہے اور کچھ جوانی کا اور کچھ اس زمانے کا جب سالک نے شرعی قوانین کے خوف سے نیک چلنی کی راہ اختیار کر لی تھی۔ان میں دریچہ سوم سابقہ تحریروں پر مشتمل ہے۔اس کو میں نے بچپن کا خیال قرار دیا ہے۔بچپن میں سالک نے مزاح نگاری بڑے دھڑلے سے شروع کی اور اسی طرح چلا رہے ہیں۔جیسے ہم آپ پاکستان کو چلا رہے ہیں۔

نے باگ ہاتھ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کہنے کو تو ہم پاکستان کو علامہ اقبال اور قائداعظم کے صلاح مشورے سے چلا رہے ہیں لیکن درحقیقت ہمیں کسی کے مشورے کی کچھ ایسی ضرورت نہیں۔ہم اس لئے ان بزرگوں کا نام لے لیتے ہیں کہ کوئی ہمیں غالب کی کی طرح بے استادہ نہ کہہ دے۔سالک نے پاکستان کی اسی حالت کی تصویر کشی کی ہے۔ایکس رے رپورٹ سے لے کر ریڈی میڈ تقریروں تک پاکستان کے باطن کو بے نقاب کیا گیا ہے۔یہ فن سالک نے کہاں سے سیکھا ہے، اس کا سراغ لگانا ضروری ہے، ورنہ لوگ اسے بھی بے استادہ کہہ دیں گے اور اسے بھی غالب کی طرح کوئی عبدالصّمد تخلیق کرنا پڑے گا۔

سالک کا زمانہ طالب علمی میرے سامنے گزرا ہے۔جب اسلامیہ کالج سول لائنز میں

درس دینے کا موقع ملا' وہاں سالک پہلے سے زیرِتعلیم آ رہا تھا۔ وہ قد کاٹھ میں استاد ہی لگتا تھا اس لئے اکثر استادوں سے دوستی کے رشتے میں منسلک تھا۔ پھر سنا کہ سالک نے فوج میں نوکری کر لی اور پنڈی میں سکونت اختیار کی۔ پنڈی جانا ہوا تو سالک سے ملاقات ہوئی۔ اس وسیلے سے فوج کے دوسرے مزاح نگاروں سے بھی دوستی ہوگئی۔ پھر جب بھی پنڈی جاتا ان فوجی بھائیوں کے پروگرام میں شریک ہو جاتا۔ کرنل محمد خان، بریگیڈیئر گلزار احمد' میجر ضمیر جعفری، سالک کے گھر پر ان مزاح نگاروں کی نشست ہوتی۔ طنز و مزاح کی فوجی مشقیں جاری ہوتیں۔ ان مجالس میں سالک جانِ محفل ہوتا اور صدّیق بیچارہ چائے کے برتن رکھنے' مہمانوں کی تواضع کرنے' سودا سلف لانے اور ایک گول مٹول سی بچی کی انا کے فرائض انجام دینے میں مصروف رہتا۔

ان فوجی مزاح نگاروں میں کون کس کا استاد تھا۔ یہ معلوم کرنا دشوار ہے کیونکہ ان میں ایک سے ایک استادی میں کمال دکھاتا تھا۔ ہاں سینیارٹی کے اعتبار سے بریگیڈیئر گلزار سب کے استاد لگتے تھے۔ ممکن ہے وہی استاد ہوتے ہوں۔ پاکستانی فوج نے پیشے کے اعتبار سے کمال کی منزلیں طے ضرور کی ہوں گی لیکن ہمیں تو بس اتنی خبر ہے کہ ہماری فوج اچھے اچھے مزاح نگار پیدا کرتی رہی ہے اور انشاءاللہ کرتی رہے گی کیونکہ اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ فوج اگر خوش ذوقی اور بذلہ سنجی سے محروم ہو جائے تو اچھی فوج نہیں رہتی۔ مغلوں کے آخری دور میں فوجیں مزاح نگاروں سے محروم ہوگئیں اور خان عالی جیسے مزاح نگار پیدا ہونے بند ہو گئے تو مغلوں کو زوال آ گیا۔ انہوں نے اس کی تلافی میدان جنگ میں طوائفیں' بھانڈ اور مسخرے ہمراہ لے جا کر کی۔

مگر وہ بات کہاں مولوں مدن کی سی

کتاب کے کچھ موضوعات گرما گرم ہیں جن کی پذیرائی کے لئے پبلک ہر وقت تیار رہتی ہے۔ کیا کریں۔ مار دھاڑ کی فلموں نے ہمارا مزاح بھی کچھ ایسا کر دیا ہے۔ سالک کے ہاں ان چیزوں کی بھی کمی نہیں' لیکن جو انداز اس نے اختیار کیا، وہ البیلا بھی ہے اور ادبی اقدار کا پابند بھی۔ موسمی چیز کو غیر موسمی بنانے کا ڈھنگ سالک کو خوب آتا ہے۔ پاکستان کو بار بار خلیفہ مارشل لاء

سے سابقہ پڑا ہے اور ادب وصحافت پر پہرے بیٹھے ہیں اس کا بالواسطہ فائدہ یہ ہوا کہ لکھنے والوں نے فلم روک کر لکھا اور دل کی بات بڑی حکمت سے دوسروں تک پہنچائی۔ سالک کے ہاں بھی ''زبان بندی'' نے نکھار پیدا کیا ہے۔ یہ نکھار دوسرے علامتی لکھنے والوں کے ہاں بھی ہے لیکن سالک کی بات ہی دوسری ہے۔ دوسرے لکھنے والوں کا اور اس کا فرق وہی ہے جو فتنہ اور عطر فتنہ کا ہے۔ کسی زمانے میں عطریات کے لئے بھائیوں کی دکان مشہور تھی۔ اب اعلیٰ پیمانے پر فوجی فاؤنڈیشن قائم ہے۔ جس میں گرم مصالحے ہی نہیں مزاح بھی ملتا ہے۔ معطّر کتاب کے اس تازہ پیک کی خوسبو بھی گرم مصالحوں کی طرح پاکستان کے ہر گھر کو مہکائے گی اور دور دور تک پھیلے گی۔ اسکیچوں کے اضافے نے اشاعت کا حلقہ اور بھی وسیع کر دیا ہے اب یہ کتاب بھارت میں بھی یکساں مقبول ہوگی کیونکہ اسلم کمال نے سالک کے ہر خاکے کے سر پر ''بودی'' کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔ امید ہے دونوں ملکوں کے درمیان اچھے تعلقات بحال کرنے میں زلف و پیماں بڑی مدد دے گی۔

◆❖⌘